FREE GIFT

رشکِ سخنم چیست شہیدِ ہوس است ایں
تلخابۂ سرجوش گدازِ نفس است ایں
غالب

حسنِ تخیّل

یعنی

منشی رشید احمدؐ صاحب رشید تھانوی

وکیل و پیروکار پولیس ریاست بھوپال

کی

اُن دلگداز اور پُردرد نظموں کا مجموعہ

جو

ادب اُردو کے بہترین رسائل ادیب، الناظر، زمانہ، پنجاب ریویو، اصلاحِ سخن، تنویر الشرق، خلاصہ، لسان العصر، زبان، مشورہ، صلائے عام، صبح بہار، کمال وغیرہ میں شائع ہو کر قبولیتِ عام کا فخر حاصل کر چکی ہیں۔

باہتمام پنچکوڑی مترا پرنٹر و پبلشر
انڈین پریس الہ آباد میں چھپکر شائع ہوا
۱۹۱۲ء

قیمت فی جلد ۸ر

فہرست مضامین

تمغہ قیصر ہند اور ۱۹۱۰ء میں خان بہادری کا معزز خطاب دیکر جناب ممدوح کی مدبرانہ قابلیت اور حُسنِ خدمات کی قدردانی کا ثبوت دیا ہے۔ ایک عرصۂ دراز سے نہایت وسیع پیمانے پر مُلک کی علمی خدمت فرما رہے ہیں منجملہ دیگر تصنیفات کے صاحب موصوف کا ایک ضخیم رسالہ فُنِ شاعری" کے نام سے شائع ہوا ہے جو اُردو میں اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب ہے۔

نہ صرف بلحاظِ ان عمدہ مناسبتوں کے بلکہ عقیدت کیش مصنف اپنے دلی جوشِ نیازمندی سے باجازت خاص اس مختصر شیرازۂ کلام کو جناب ممدوح کے اسم گرامی پر بمصداق ذیل معنون کرنے کا فخر حاصل کرتا ہے

زقدر و شوکتِ سلطاں نگشت چیزے کم
کلاہ گوشۂ ارشد بآفتاب رسید

ریاست بھوپال
یکم اکتوبر ۱۹۱۱ء

احقر
ارشد تھانوی



ارشد تھانوی

میرا عنوان ہے عجب شان سے زیب ہستی * محو نظارۂ تصویر فریب ہستی

The Indlian Press, Allahabad.

دیباچہ

زبان عرب کا یہ مقولہ بالکل صحیح ہے، کہ شعراء خدا کے شاگرد ہیں، یعنی بیواسطہ اُن کو مبدءِ فیاض سے فیض پہنچتا ہے۔ غور کیجئے کہ جب کوئی شاعر یا انشا پرداز نظم یا نثر لکھنے بیٹھتا ہے، تو اُس کے ہاتھ میں صرف قلم اور سفید کاغذ ہوتا ہے۔ وہ یہ تو ضرور سوچ لیتا ہے، کہ مجھے فلاں عنوان پر لکھنا ہے لیکن اُس کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ میں کیا لکھوں گا، اور عنوان (دعویٰ) پر کیا کیا دلائل لاؤں گا، کس کس پہلو سے بحث کروں گا؛ مگر تھوڑی سی دیر میں، جب طبیعت متوجہ ہوتی ہے، اور قلم جولانیاں دکھاتا ہے، تو وہی سادہ کاغذ سیاہ ہو جاتا ہے۔ آخر یہ کہاں سے آیا؟ اُسی مبدءِ فیاض کی طرف سے، جسے الہام کہنا بجا ہے۔

خیالات درآئی میں طبیعت کا عجیب رنگ ہوتا ہے۔ جس طرح مکڑی اپنے ہی لعاب دہن سے جالا پورتی چلی جاتی ہے، اور اپنا خیمہ تننے میں اُس کو

کسی کی مدد کی حاجت نہیں ہوتی، یہی کیفیت شاعر اور انشاپرداز کی ہوتی ہے۔ یہ قدرت کی طلسم کاری، بلکہ اعجاز ہے، کہ تہیدست شاعر صفحۂ قرطاس پر جواہر بے بہا بکھیرتا چلا جاتا ہے، جو اس کے خزانۂ دل یا کانشنس کی کان میں پہلے سے موجود اور مخزون نہیں ہوتے، بلکہ جس قدر درکار ہوتے ہیں مبدء فیاض اُسے بتدریج آناً فاناً عطا کرتا رہتا ہے۔ پھر یہ اُن کو اپنے لئے کام میں نہیں لاتا، بلکہ دنیا کو اُن سے ہمیشہ کے لئے مالا مال کرتا ہے، اور انسانوں کے سینے ان جواہرات کے گنجینے ہو جاتے ہیں۔ اگر شاعروں، اور انشاپردازوں، اور مصنفوں کا وجود نہ ہوتا، تو دُنیا جہل کے گھُپ اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتی، اور آنکھیں، مانگتی پھرتی۔ موجودہ زمانے کا سائینس اور فلسفہ اور لٹریچر میرے دعوے پر خوب روشنی ڈالتا ہے۔ علم و عقل کی جو کچھ جگاجوت نظر آ رہی ہے، سب انشاپردازوں اور مصنّفوں کی بدولت ہے۔ مورّخوں نے اپنی دماغ سوزیوں سے عبرت کے کیا کیا سبق آنے والی نسلوں کو نہیں پڑھائے، اُن کے دلوں میں کیا کیا حوصلے اور اُمنگیں اور ولولے پیدا نہیں کئے، کیسے کیسے مُلک فتح نہیں کرائے۔ جنگوں کے جگر فرسا معرکوں میں رجز خوانوں نے طبقے اُلٹ دئے ہیں، مردہ دلوں کو زندہ کر دیا ہے، شکست کو فتح بنا دیا ہے۔ کوئی قوم ایسی نہیں، جو جنگوں میں رجز کے اشعار نہ پڑھتی ہو، اور مردانِ نبرد آزما کے حوصلے نہ بڑھاتی ہو۔ جنگی باجے اور سرود سب اشعار ہی ہیں۔

میں نہیں کہتا کہ تمام شعرا حکیم و فلسفی ہیں، اور سب کا کلام یکساں پُر اثر اور طبائع میں انقلاب پیدا کرنے والا ہے، خصوصاً اُردو شعرا کا کلام، بلکہ مقصد یہ ہے، کہ جس قسم کا کلام کسی کی طبیعت سے سرزد ہوتا ہے، وہ ایک الہام ہوتا ہے، اور الہام کے لئے یہ ضرور نہیں کہ وہ اچھے ہی خیالات لیکر وارد ہوتا ہو۔ بلکہ اس کا حصر کانشنس پر ہے۔ جیسا کانشنس ہوگا۔ اُس پہ ویسا ہی الہام ہوگا۔ شعرگوئی کے لئے اولاً موزونیِ طبع درکار ہے، پھر مشق۔ چند روز میں خامی پختگی سے بدل جاتی ہے۔ پیش پا اُفتادہ پست خیالات بلند ہوجاتے ہیں خود بخود طبیعت سے نیچرل اور سوشیل مضامین نکلنے لگتے ہیں: بشرطیکہ اُن کا ارادہ کیا جائے۔ اور طبیعت کو اگر شاعری کی اصلی حقیقت کے ادراک پر مائل کیا جائے، تو یہی تغزّل اور ریختہ، جس کو اردو شعرا شاعری کی جان سمجھتے ہیں، کچھ کا کچھ ہوجاتا ہے۔

ناظم شروانی خاقانی لکھتا ہے ؎

دلم قصرے مشبک داشت ہمچوں خانِ زنبوراں ۔۔۔ بروں سادہ در و بام و دروں نعمت فراوانش

نہ خانِ عنکبوت آسا سراپردہ زدہ بیروں ۔۔۔ دروں ویرانہ و بر خواں مگس ہنید بریانش

یعنی میرا دل اس سے پہلے ایک سوراخ دار محل رکھتا تھا، جیسا شہد کی مکھیوں کا چھتا، کہ باہر سے تو دروازہ اور بام بالکل سادہ مگر اندر بہت سی نعمت (شہد) سے معمور، یہ نہیں کہ مکڑی کے جالے کی طرح کہ باہر تو سراپردہ تنا ہوا اور اندر ویرانہ، اور خوان پر چند بھنی ہوئی مکھیاں رکھی ہیں، جنکے کھانے سے قَے ہوجائے۔ شعر میں

بلاغت یہ ہے کہ شہد بڑی نعمت ہے، اگر کوئی شخص قَی کے مرض میں مبتلا ہو، تو شہد کے استعمال سے شفا ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شاعری ایک نعمت ہے، بشرطیکہ اخلاقی اور فطری ہو۔ عشقیہ (فسقیہ) مضامین کانشنس کو تباہ و برباد کرنے والے ہیں، اور ایسے ہیں، جیسی شہد کے مقابلے میں قَی اور مکھی۔ شعر وہی ہے، جس سے انسانی اخلاق درست ہوں، الہٰیات کی چاشنی بھری ہو، فطرت و معرفت کے خمیر میں گوندھا گیا ہو۔ الہام جس طرح نثر میں ہوتا ہے، اسی طرح نظم میں ہوتا ہے۔ بُرے خیالات بھی الہام ہی ہیں۔ مولٰینا عبدالقادر بیدل مرحوم اپنے نکات میں فرماتے ہیں :۔

اگر منکرِ نبوت نۂ باوسوسات ہم جز بہ تعظیم پیش میا، واگر بر تجلّے ایمان واری،

ہیچ جانب چشمِ بے ادب مکشا۔

یعنی اگر تو نبوت کا منکر نہیں تو وسوسات کی بھی تعظیم کر، کیونکہ وسوسات ہی بالآخر سچے الہامات ہو جاتے ہیں، اور اگر تو تجلّی پر ایمان رکھتا ہے، تو ہر شئے کو ادب سے دیکھ۔ کفر بھی جلوۂ الہٰی کا منظر و مظہر ہے۔ اِسی بنا پر مولوی جامی فرماتے ہیں ؎

شاعری جزوے ست از پیغمبری ‏ ‏ جاہلانش کفر خوانند از خری

انسانی طبیعت کو کلامِ موزوں، اور مقفّیٰ و مسجّع زیادہ مرغوب ہے، لہذا حکما اور

اور گلاب ملانے سے زیادہ لذیذ اور دلچسپ ہو جاتا ہے، اور طبیعت کو اُسکے پینے سے سکون اور سیرابی حاصل ہوتی ہے۔ پھر اشعار جلد یاد ہو جاتے ہیں، نثر یاد نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف بڑے بڑے شعراء اور حکماء کو بلکہ تھوڑے لکھے پڑھے آدمیوں کو بھی، اُن کے مذاق کے موافق بیسیوں اشعار یاد ہوتے ہیں، اور اکثر اوقات بڑے مزے سے پڑھتے اور غنغناتے اور وجد میں آتے ہیں۔ جب مقرر یا واعظ تقریر کرتا ہے، تو حسبِ موقع اشعار پڑھنے سے سامعین کو گرماتا اور اپنی تقریر کو دلچسپ بناتا ہے۔

موزوں اور مقفیٰ کلام سے انسان کو بالطبع اُنس ہے، اور اسکی وجہ یہ ہے کہ حرکات بنضیہ، دوران خون کے ساتھ، ہر وقت تڑاق پڑاق چلتی رہتی ہیں۔ جن میں موزونیت ہی نہیں، بلکہ لَے اور سُر حسبِ قواعد موسیقی موجود ہیں، کیونکہ راگ جس سے عبارت ہے، وہ اصوات کا تکرر ہے۔ یعنی تال اور سُر کا بار بار لوٹ لوٹ کر آنا، اس طرح کہ ساتھ ہی خلوءِ زماں بھی ہو یعنی کچھ وقفے کے بعد ایک ہی آواز کا توارُد ہوتا رہے، جیسی ٹھیکے کی گت۔ اگرچہ ٹیس بڑھا کر دوسری آوازیں بھی نکلتی ہوں، مگر اُس ٹھیکے سے باہر نہ ہوں۔ مثلاً پکھاوج وغیرہ پر جب دُھرپت گائی جاتی ہے، تو ساتھ ہی پرَن کا سلسلہ ہوتا ہے، مگر اصل ٹھیکے اور گت سے باہر نہیں ہوتا، بلکہ حُسنِ صوت اور موسیقی کا رنگ جمانے اور راگ کا کمال دکھانے کے لئے ہوتا ہے۔ شعر کے موزوں اور دلکش بنانے میں بھی دخل

صنائع و بدائع اور محسنات بیان و معانی کو ہے۔

تمام اقوام کو موسیقی کی جانب فطرۃً میلان ہے، جس کے لئے شعر کا ہونا ضروری ہے۔ اگر شعر نہ ہوتا تو موسیقی ایک جسم بیجان ہوتا۔ جو شخص کچھ گاتا یا غنغناتا ہے، اور جو لوگ آلات موسیقی کا شغل رکھتے ہیں، غیر ممکن ہے کہ وہ شعر سے خالی ہوں۔ جنگی باجے میدانِ ہیجاء میں سپاہ کے اندر غلیان اور ہیجان پیدا کر دیتے ہیں۔ مولینا نظامی جنگ روس و سکندر میں فرماتے ہیں ؎

ز آواز خر مہرہ گاؤ دُم　　　علی اللہ بر آمد ز روئینہ خُم

ایک ہندی دوہا ہے ؎

سُورا رن میں جائے کر، کاہِں ڈھونڈہت ساتھ

ساتھی تیرے تین ہیں: ہیا کٹار اور ہاتھ

یعنی "اے بہادر! تُو جنگ میں کس کا ساتھ ڈھونڈھتا ہے؟ تیرے ساتھی صرف تین ہیں، دل اور تلوار اور ہاتھ" ایسے ہی جرارت دلانے والے رجز وقتِ فوج جان دیدیتی ہے۔ (عربی میں اشعار جنگ کو رجز کہتے ہیں، اور ہندی میں کرکھا)

عرصہ ہوا، میرے وطن (شہر میرٹھ) میں ایک تیرتھ کے لئے جاتری نکلے۔ میں بزازے میں کپڑا خرید رہا تھا۔ تیرتھ کے سنگیت ایک وجد و رقص کی حالت میں ننگے سر، ننگے پاؤں ستار اور طنبورا وغیرہ پر یہ ترانہ بیخودی کے عالم میں تیرتھ کے آگے آگے

گاتے جاتے تھے ؎

آوے درد میں، آوے درد میں ۔۔۔ بپتا میں آوے، راما آوے درد میں

سُکھ سمپت میں آوے ناہیں ۔۔۔ وا مہا بید تو دھاوے درد میں

یعنی پرمیشور جب آتا ہے تکلیف اور مصیبت کے وقت آتا ہے۔ وہ سُکھ اور چین کے سمے میں نہیں آتا۔ مہا بید (بڑے طبیب) کا تو یہی فرض ہے، کہ بیماری کے وقت دُکھ سے موکش (نجات) دینے کو آئے۔

یہ ترانہ سُن کر مجھ پر وہ عالم طاری ہوا جسکا مزہ ابتک لے رہا ہوں۔ یہ سیدھے سادے نیچرل انترے ہیں۔ نہ ان میں رنگ آمیزی ہے، نہ مبالغہ ہے، نہ صنائع بدائع ہیں، مگر کتنے پیارے اور دلکش ہیں۔ ہمارے سیکڑوں شعرا جن کا مذاق جن اور پری از عیب بری اور حور دور از قصور از دُنیا نفور سے آگے نہیں بڑھتا، ایسے انتروں کو واہیات و خرافات اور دندان تو جملہ در دہانند بتائیں گے اِس مضمون سے ملتا جلتا ہے ایک دوہا کسی ہندی کویشر نے اور بھی کہا ہے ؎

دُکھ میں سب ہر کو بھجیں، اور سُکھ میں بھجے نہ کوے

جو سُکھ میں ہر کو بھجے، تو دُکھ کاہے کو ہوے

سبحان اللہ۔ یہ سحر حلال ہے، سہل ممتنع ہے، یعنی خدا کو سب دُکھ میں یاد کرتے ہیں، اگر سُکھ میں یاد کریں، تو دُکھ ہی کیوں ہو؟ دیکھئے، یہ دوہا غافل انسانوں کی حالت کا آئینہ ہے۔ اِس کے جتنے معنی چاہو پھیلاتے چلے جاؤ۔ اِس کے مطابق

ایک اور مشرقی حکیم کہتا ہے، کہ جو فاتح سپہ سالار اپنی شکست کو فتح کے وقت نہ بھولے گا، وہ کبھی شکست نہ کھائیگا۔یعنی فتح کے وقت شکست کو نہ بھولنا چاہئیے۔

بھاشا کے کوِیشر عاشقانہ مضامین بھی غضب کے لکھتے ہیں، انمیں بھی نیچرل چھینٹا ہوتا ہے ؎

باہنہ چھُڑائے جات ہو نبل جان کے موے
ہردے میں سے جاؤگے، تو مرد بدُوں گی توے

یعنی "مجھے کمزور جان کر بانہہ چھڑا کر جاتے ہو، میں تو تمہیں مرد جب سمجھوں گی کہ دل میں سے بھی چلے جاؤ" شوق اور بروگ بھرا کتنا پیارا دوہا ہے۔

شاعری تمام علوم وفنون اور معلومات کا منتہا ہے۔یعنی شاعر جن امور کا مشاہدہ کرتا ہے، اور اُن سے تجربہ اُٹھاتا ہے، نظم و نثر یا مختلف اشعار میں اُنکا اظہار کرتا اور دنیا کو معلومات میں آپ جیسا بناتا ہے۔ وہ جو کچھ لکھتا ہے، تحقیق و انکشاف کے بعد لکھتا ہے، پس شاعر کے لئے لٹریچر اور محاورات ہی سے واقف ہونا کافی نہیں، بلکہ تمام ضروری علوم وفنون کے اکتساب کی بھی ضرورت ہے، کیونکہ جس قدر معلومات وسیع ہوگی، اسی قدر طبیعت میں مضامیں کا تراکم ہوگا۔یہی وجہ ہے کہ تمام مشہور ایشیائی شعراء حکیم اور فلسفی اور متکلم گزارے ہیں۔ان کا کلام دیکھا جاتا ہے تو وسعتِ معلومات پر بے تحاشا تحسین و آفریں زبان سے نکلتی ہے۔

خاقانی اپنے حاسدوں اور اپنے کلام کے سارقوں کی مذمت میں لکھتا ہی ؎

من میوہ دار حکمتم از نفسِ ناطقہ
ولیشاں زروئے نامیہ جز نارُون نیند

نارُون انار کی چھوٹی کلی کو کہتے ہیں، جو نہ بڑھتی ہے، نہ اُس کا انار بنتا ہے، کھل کر مرجھا جاتی ہے۔ اور چھوٹے پھول بعض ترکاریوں، کدّو وغیرہ کو بھی لگتے ہیں، اور جلد مُرجھا کر معدوم ہو جاتے ہیں، اور بعد میں سچے پھول لگتے ہیں، اور انہیں کے کدّو بنتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میں تو اپنے نفس ناطقہ کے فیض سے حکمت کا میوہ دار درخت ہوں، پھولتا پھلتا ہوں، اور یہ (میرے حاسد اور سارقین) قوت نامیہ کی رُو سے انار کی کچّی کلی ہیں، یعنی قوتِ نامیہ کا اُن پر اتنا ہی اثر ہوتا ہے کہ کلی بن کر کھلے اور برباد ہو گئے۔ ایک اور قصیدے میں اپنے سارقانِ سخن کی مذمّت کرتے ہوئے لکھتا ہے ؎

دلِ شاں زمیوہ دار حدیثم خورد غذا
انجیر خور غریب نباشد غرابِ شاں

یعنی اِن کا دل میرے میوہ دار کلام سے غذا کھاتا ہے۔ اگر اُن کا کوّا انجیر کھانیوالا ہے تو یہ تعجب کی بات نہیں۔ بات یہ ہے کہ کوئی جانور کچّا انجیر نہیں کھا سکتا، کیونکہ اُس میں لَس ہوتا ہے، چونچ چپک جاتی ہے؛ مگر کوّا چونکہ سیانا جانور ہے، لہٰذا کھاتا جاتا ہے اور چونچ صاف کرتا جاتا ہے۔ پس شکم سیر ہو کر انجیر چٹ کر جاتا ہے۔ مقصود شعراء کی تحقیقات و معلومات کا اظہار ہے، کہ اِن کی نظر کتنی وسیع تھی۔

میں بیحد خوش ہوتا ہوں، جب دیکھتا ہوں کہ ہندوستان بھی مہذب اور شائستہ لٹریچر میں ترقی کر رہا ہے، اور نیچرل اور سوشیل انشا پرداز اور شعراء پیدا ہو رہے ہیں۔ ہندوستان کے باشندے فطری ذہانت و فطانت میں مشہور ہیں۔ گزشتہ شعراء اور کولیشر کیا کچھ نہیں کر گئے۔ اُن کے کارنامے موجود ہیں، جنکے ترجمے مغربی ممالک کے باشندوں نے بڑے فخر سے اپنے لٹریچر میں کئے ہیں، اور اُن کو درسوں اور کورسوں میں داخل کر لیا ہے۔ اِنکے کمالات، علوم و فنون پر ہندوستان جسقدر فخر کرے بجا ہے۔ اُن کے جواہرات ویرانوں کے گوشوں میں دبے ہوئے تھے، مغربی جوہریوں نے ان کو نکالا اور تاج حکومت میں جڑا۔ اب تاج کی طرف سے کوشش ہو رہی ہے کہ اہلِ ہند فکر کی کاوش سے ویسے ہی جواہرات اپنی کانِ طبیعت سے نکالیں، اور وہ بھی تاج میں جگہہ پائیں۔ کان کن پیدا ہو رہے ہیں، مگر ان کی طبیعت کے تیشہ میں ابھی تک تیزی نہیں آئی۔ تاہم "دیر آید درست آید" پر نظر کر کے مایوسی کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

الوالعزمی اور ہمّت مردانہ بڑی نعمت ہے۔ قدرت بخیل نہیں۔ جو کام ایک انسان کر سکتا ہے، کیا وجہ ہے کہ دوسرا نہ کر سکے تلسیؔ داس، کیشوداس، کالی داس، کی نظیریں کیوں پیدا نہ ہوں، خاقانیؔ، انوریؔ، فردوسیؔ، نظامی وغیرہ جیسے باکمال لوگ دُنیا میں کیوں نہ آئیں فیض کا دروازہ بند نہیں ہوا، زمانہ عقیم نہیں ہو گیا۔ انسان کے ہاتھہ میں قدرت نے طرح طرح کی طاقتوں کی کُنجیاں

دیدی ہیں ۵

درِ فیض است منشیں از کشایش ناامید اینجا

بہ رنگِ دانہ از ہر قفل می روید کلید اینجا

گزشتہ اہل کمال نے کیسی کیسی محنتوں اور جانکاہیوں سے علوم و فنون حاصل کیے۔ کُربتِ غربت اختیار کی۔ راحت و آرام کو تکالیف پر قربان کیا۔ فقر میں زندگی بسر کی۔ ہر وقت کتاب سے کام رکھا۔ نہ اچھا کھانا، نہ اچھا پہننا، بلکہ فاقے بھوگے۔ مل گئی تو کھالی، ورنہ وِدّیا کا بھوگ ہے اور وہ ہیں۔ اسی میں مگن، اور اسی میں خورسند ہیں۔ پاٹ شالاؤں اور مدارس میں اینٹوں اور پتھروں کا فرش، اُن کے لئے کمخواب اور سمور و سنجاب کا گہوارہ ہے۔ مٹی کا چیکٹ لگا دیا ہے، جسمیں سرسوں کا تیل پڑا ہے۔ کتاب سامنے رکھی ہے، چراغ کا دھواں دماغ میں جارہا ہے کیسا لمپ اور کیسا گلوب۔ پھر ایسی جانکاہیوں اور دماغ سوزیوں کا اُن کو کیسا پھل ملتا تھا۔ کیسے کیسے باکمال وِدوان فارغ التحصیل ہو کر نکلتے تھے، جنکا جواب موجودہ زمانے میں، جسے اپنی شائستگی اور تعلیم و تربیت پر گھمنڈ ہے، پیدا ہونا محال ہو رہا ہے، اور جنکی تصانیف آج کے روز کالجوں اور یونیورسٹیوں کی جان ہیں۔

موجودہ زمانہ تو طلباء کے لئے بہشت ہے۔ اچھا کھانا، اچھا پہننا لوازم تعلیم سے ہے۔ حفظِ صحت کا ہر دم لحاظ ہے۔ آئے دن تعطیلوں کی بھرمار، گویا سال بھر میں چھ ماہ تعلیم پائیں، اور چھ ماہ ڈنڈے بجائیں۔ پاس ہو جانا بھی قسمت سے ہے،

نہ کہ تکمیلِ علوم سے یہی وجہ ہے کہ ویسے علماء اور فضلاء اور پنڈت پیدا نہیں ہوتے۔ کیا زبانِ سنسکرت میں کوئی فصیح اور بلیغ نظم لکھ سکتا ہے؟ ہمارے خیال میں تو کوئی صحیح نہیں لکھ سکتا۔ سنسکرت تو بہت دور ہے، بھاشا کا بھی کوئی شاعر کامل نہیں یہی حال زبان عرب کا ہے۔ کیا کوئی شخص بے تکلف ہندوستان میں زبان عرب بول سکتا ہے، یا عربی میں فصیح و بلیغ بلکہ صحیح نظم و نثر لکھ سکتا ہے، ہرگز نہیں۔ اردو شاعری ویسی ہی ہے، جیسی طرّہ اور کلغی والوں کی خیال بازی، جو دف پر گائی بجائی جاتی ہے۔ پس وہ شعراء اردو مغتنمات سے ہیں، جو موجودہ زمانے میں اردو زبان کو شایستہ بنا رہے ہیں، اور اس میں سوشیل اور نیچرل رنگ پیدا کر رہے ہیں۔

کتاب **حُسنِ تخیّل** جو جناب منشی رشید احمد صاحب ارشد تھانوی کی جدت پسند طبیعت کا کارنامہ اور مختلف اقسام نظم کا مجموعہ ہے، میرے سامنے ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ زیادہ تر موجودہ زمانے کے نیچرل اور سوشیل رنگ میں رنگا ہوا اور شعراء اردو کے ممتاز کلام میں سے ہے۔ مصنّف نے پاکیزہ طبیعت پائی ہے۔ کلام مربوط و مضبوط ہے۔ حشو کم ہے۔ نزاکت و ندرت بھی پہلو بہ پہلو ہے۔ مغربی و مشرقی دونوں رنگ ہیں۔ جیسے کسی صنم کی چمکتی ہوئی پیشانی پر مختلف رنگوں کا قشقہ، جو از حد دلاویز اور دلکش ہو۔ یہ دو رنگی اُسوقت تک پیدا نہیں ہو سکتی، جب تک کوئی مصنّف مشرقی اور مغربی دونو قسم کا تعلیم یافتہ اور دونوں کے جذبات و خیالات سے

ماہر نہ ہو۔ اور چونکہ اُردو زبان روز بروز صاف و شفاف و مجلّٰی ہو کر اپنے نکھار کی بہار دکھا رہی ہے، اُس میں بالطبع یہ خاصّہ ہے کہ ہر زبان کے خیالات کو جذب کر لیتی ہے، اور اپنے لٹریچر کے قالب میں ڈھال کر کچھ اور ہی رنگ روپ پیدا کر دیتی ہے۔ لہٰذا یہ مجموعۂ نظم اُردو زبان کی صنعت کاری سے عجیب آن بان دکھا رہا ہے۔ اجنبی زبان کے خیالات کا اپنی زبان میں لانا، اور نظم کے دلکش اسلوب میں ترتیب دینا آسان کام نہیں، خصوصاً جبکہ ترجمہ کیا جائے۔ کیونکہ مغربی زبانیں سب مکمّل ہیں اور اُردو زبان نے ابھی تکمیل کے پہلے زینے پر قدم رکھا ہے، اور ترجمے کے لئے الفاظ کا ملنا اُردو جیسی غیر مکمل زبان میں جیسا کچھ مشکل ہے، اُسے مترجم ہی خوب جانتے ہیں۔ اور پھر اُن کو نظم کی لڑی میں پرو کر پبلک کے گلے کا موزوں و مرغوب ہار بنانا اشکال پر اور بھی طرّہ ہے۔ آپ جانئے ایک تو کریلا پھر نیم چڑھا۔ اس لئے جناب ارشد جسقدر داد اور صلہ کے مستحق سمجھے جائیں، بجا ہے۔ پھر بڑی بات یہ ہے کہ آپ نے خداداد طبیعت پائی ہے، کسی سے تلمّذ نہیں۔ اور ایسے افراد بہت سے ہیں، جن کو تلمّذ براہ راست مبدءِ فیاض سے ہے۔ طبیعت کا موزوں ہونا اکتساب پر موقوف نہیں۔ مولوی روم علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

شعر میگوئیم چوں آبِ حیات
من نہ خواندم فاعلاتن فاعلات

اب رہی مضامین کی پستی و بلندی یا تسامح اور ضعفِ تالیف، یا کوئی فروگزاشت۔ اِس سے کسی انسانی کلام کا خالی ہونا شاذ و نادر ہے۔ بڑی بات یہ دیکھنا ہے کہ

شاعر نے کیسا خونِ جگر کھایا ہے، اور نظم میں اُسکو کیا کیا دشواریاں لاحق ہوئی ہیں۔ اور جس شعر میں کوئی سقم رہ گیا ہے اُسکی کیا وجہ ہے۔ اعتراض کر دینا آسان ہے، مگر ویسا نمونہ دکھانا مشکل ہے۔ بعض اعتراضات قصورِ سخن فہمی اور فتورِ سوءِ ذہن کا بھی نتیجہ ہوتے ہیں۔ مولینا نظامی گنجوی رح نے بادشاہ کی تعریف میں شعر ذیل لکھا تھا۔

چو بر دریا زنی موجِ پلالک   بماہی گاؤ گوید کیفَ حالک

ایک طالب علم نے کہا "مصرعۂ ثانیہ غلط است چہ حالک بایستے نکہ منصوب۔ زیرا کہ حالک مبتدا، موخر واقع شدہ است" مولینا نظامی نے ہنسکر فرمایا "شعرم را بمدرسہ کہ برد۔ گاؤ نحو نداند" یعنی "میرا شعر مدرسہ میں کون لے گیا"۔ مولینا کا یہ فرمانا بطور مذاق تھا۔ یعنی شعر کے مصرعہ دوم میں کیف حالک گائے کا مقولہ ہے اور گائے نحو نہیں جانتی کہ صحیح اعراب پڑھ سکے۔ مگر درحقیقت بیوقوف معترض پر تنبیہ تھی کہ تجھے یہ معلوم نہیں کہ پلالک بفتح و ضم دونو طرح مستعمل ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ اے ممدوح اگر تو دریا پر تیروں کی موج مارے، یعنی تیر برسائے، تو گاؤ زمین حوت سے کہے کہ تیروں نے تیرا کیا حال کر دیا۔ پُرانے خیالات کے موافق کرۂ ارض گائے کے سینگوں پر ٹھہرا ہوا ہے اور گائے مچھلی پر، اور جب زلزلہ آتا ہے تو اسکی یہ وجہ ہوتی ہے کہ گائے اپنا سینگ بدلتی ہے یعنی ایک سینگ تھک جاتا ہے، تو کرۂ ارض کو دوسرے سینگ پر اُٹھاتی ہے۔

اب ہم حضرت ارشد کے چند اشعار مع تنقید ذیل میں درج کرتے ہیں، اور

اِسی پر اِس مختصر دیباچہ کا خاتمہ ہے۔ مناجات میں لکھتے ہیں ؎

آتا نظر نہیں ہے، گو آستان تیرا لیکن بنا ہے سب کے دل میں مکان تیرا

مصرعۂ اولیٰ کی بندش میں اُلجھن اور تقدیم و تاخیر ہے اور دوسرے مصرعے میں خود دل کو مکان بنانا چاہیئے، نہ کہ مکان کے اندر مکان۔ مثلاً

دیکھا نہیں کسی نے گو آستان تیرا لیکن ہر اک بشر کا دل ہے مکان تیرا

ہر ایک کو عطا کی اک شانِ خاص تو نے رکھا ہر اک طبیعت میں اختصاص تو نے

خاص اور اختصاص میں ایطاء ہے، کیونکہ مادّہ دونوں کا ایک ہے۔ لہذا پورا مصرعہ تغیر طلب ہے ع

قدرت پر اپنی رکھی بُرہانِ خاص تو نے

بلبل کو گلستاں میں آہ و فغاں ملی ہے پاکر ہنسی، چمن کی ہر اک کلی کھلی ہے

مصرعۂ اولیٰ میں گلستاں کے ہوتے دوسرے مصرعے میں چمن حشو ہے، اور ہنسی پانا محاورہ نہیں ہے ع

کرنے کو خندہ اُس پر اک اک کلی کھلی ہے

دی سرو کو بلندی، نرگس کو چشم حیراں لالہ نے داغ پایا، سنبل نے زلفِ پیچاں

دونوں مصرعے باہم مربوط نہیں۔ مصرعۂ اول میں لتعدیہ، دوسرے میں لزوم ع

لالہ کو داغِ حسرت، سنبل کو زلفِ پیچاں

سوزِ پنہاں کے عنواں سے تحریر فرماتے ہیں ؎

تپشِ دل نے عجب شان بنا رکھی ہی   شررِ عشق نے اک آگ لگا رکھی ہی

تپشِ دل اور شررِ عشق میں کچھ فرق نہیں ع

جگر و سینہ میں اک آگ لگا رکھی ہے

فرطِ سوزش سے ہوئے آبلے پیدا لیکن   شمع کی طرح گدازی ہی مجھے محفل میں

مطلق گدازی محاورہ نہیں۔ البتہ دلگدازی جگر گدازی محاورہ ہے، یا صرف گداز ع

شمع ساں سینہ گدازی ہی مجھے محفل میں

ہمہ تن داغ ہوں، داغوں سے نمایاں ہوں میں   چشم ناظر کے لئے سرو چراغاں ہوں میں

چشمِ ناظر محاورہ نہیں ع چشمِ بینا کے لئے سرو چراغاں ہوں میں۔ اور حشو کا خیال ہو تو یوں بہتر ہے ع

چشمِ عبرت کے لئے سروِ چراغاں ہوں میں

اشعار میں الفاظ کا دبنا کثرت سے ہے مگر ایسے اسقام بڑے بڑے مشہور شعراء کے کلام میں بھی ہیں۔ لہذا حضرت موصوف کا کلام ہر طرح قابل تحسین ہے۔ خدائے تعالیٰ آپ کے دل و دماغ میں زیادہ قوت دے۔ امید کی جاتی ہے کہ ایسی فروگزاشتیں چند روز بعد خود بخود بہ اصلاح ہو جاینگی، کیونکہ آپ ذہین اور فطین ہیں، اور موجودہ حالت میں بھی اچھے اچھے شعراء سے اچھے ہیں ع

اللہ کرے حسنِ رقم اور زیادہ

دفتر ادیب الہ آباد
اکتوبر سنہ ۱۹۱۱ء

پیارے لال شاکر (میرٹھی)

بِسمِ اللهِ الرَّحمٰنِ الرَّحِيمِ

مناجات

اے کُل جہاں کے خالق ہر شے بنانیوالے
نیرنگیوں سے بزمِ ہستی سجانیوالے

وہم و گمان پائیں کیا آن بان تیری
اِس سے بہت زیادہ اونچی ہی شان تیری

آتا نظر نہیں ہے گو آستان تیرا
لیکن بنا ہے سب کے دل مین مکان تیرا

قدرت کے ہیں کرشمے ہر سو تیری ہویدا
جلوہ ہے تیرا سب میں جو کچھ ہوا ہی پیدا

ہر ایک کو عطا کی اک شان خاص تو نے
رکھا ہر اک طبیعت مین اختصاص تو نے

جس دل کو جیسا چاہا اُس رنگ کا بنایا
اِک موم کا بنایا اِک سنگ کا بنایا

عُشّاق کو دیا ہے سوز و گداز تو نے
بخشتے ہیں مہوشوں کو انداز و ناز تُو نے

اِک بندۂ رضا ہے جاندادۂ وفا ہے
اک بانئِ ستم ہے آمادۂ جفا ہے

بُلبل کو گلستاں میں آہ و فغاں ملی ہے
پا کر ہنسی۔چمن کی ہر اک کلی کھِلی ہے

دی سرو کو بلندی۔نرگس کو چشمِ حیراں
لالہ نے داغ پایا سنبل نے زلفِ پیچاں

سبزے کو کر دیا ہے خوابیدہ سو رہا ہے
گریاں اُسے بنایا ہے - ابر رو رہا ہے

پرواز پا کے خوش ہیں اونچی اُڑان والے
اپنے کو جانتے ہیں وہ آسمان والے

پروانہ کو ہوا ہے سوزِ دروں عنایت
سینہ میں رکھ دیا ہے اُسکے شرارِ الفت

رکھا ہے شمعِ محفل کو تو نے وقفِ زاری
رہتی ہے صبح تک وہ مصروفِ اشکباری

مجھکو عطا ہوا ہے دردِ نہاں جگر میں
شوریدگی کا سودا رکھا گیا ہے سر میں

بخشی دعا کو تو نے تاثیر یا الٰہی
میری بھی اب بدل دے تقدیر یا الٰہی

اے کارسازِ عالم - بگڑی بنانے والے
ہر اک بُری بھلی سے مجھکو بچانے والے

اس دل کی الجھنوں سے مجھکو نجات دیدے
اس زندگی سے اچھی اور اک حیات دیدے

ان بیقراریوں سے اس فرطِ غم سے چھوٹوں
ان آہ و زاریوں سے درد و الم سے چھوٹوں

بیتابیوں سے مجھکو یارب سکون ہو جائے
میری رگوں میں پیدا اک اور خون ہو جائے

یہ اضطرابِ دل مجھکو نہ پھر ستائے
یہ بیکلی نہ مجھکو پھر آکے مُنہ دکھائے

مجھ پر پڑے نہ سایہ نیرنگیِ جہاں کا
چلنے نہ پائے مجھ پر کچھ زور آسماں کا

ہو گردشِ زمانہ سے بال تک نہ بیکا
دشمن بنے نہ کوئی میرا نہ میں کسی کا

پُرامن زندگی ہو آرام سے بسر ہو
جھگڑا کسی طرح کا ہو اور نہ شور و شر ہو

صنّاعیوں کو یارب فطرت کی جا کے دیکھوں
دشت و جبل میں شوکت قدرت کی جا کے دیکھوں

تودوں میں برف کے ہو کوہِ بلور کا لطف
موسیٰ کی طرح مجھکو حاصل ہو طور کا لطف

وہ چوڑے چکلے دریا چاندی بہانیوالے
وہ شام کو شفق کی ہلکی گلابی رنگت
دامن میں اپنے تاروں کو شب کا لیکے آنا
وہ صبح کو اُفق سے خورشید کا نکلنا
دلچسپ کسقدر ہیں اور جانفزا یہ منظر

ہوں اپنی سینری پر مجھکو لٹانیوالے
وہ بدلیوں کا منظر وہ اُنکی آبی رنگت
اُن کا چمک دمک کر دل کو مرے لُبھانا
کرنوں کا اُسکی آکر گر پڑنا اور مچلنا
لُطف ان سے ہو اُٹھانا یارب مجھے مُیسّر

کرے قبول یارب ارشد کی یہ دعائیں
ہونے نپائیں رد اب ارشد کی یہ دعائیں

فلسفۂ اتحاد

یورپ کا مشہور شاعر شیلے کہتا ہے "دُنیا میں کوئی چیز اکیلی نہیں"
"تمام چیزیں ایک قانون الٰہی سے ایک دوسرے کی ہستی میں مل جاتی ہیں"
اشعار مندرجہ ذیل اسی فلسفی شاعر کے زبردست خیالات کی امداد سے ترتیب دئے گئے ہیں۔

اے کہ مہجوریِ عشاق روا میداری
بندگاں راز برِ خویش جدا میداری

چاند کی کرنیں سمندر میں گرا کرتی ہیں
جوشِ اُلفت میں اُسے چُوم لیا کرتی ہیں

جلوہ گر شرق سے ہوتا ہے جو مہرِ انور
روشنی اُسکی لپٹتی ہے زمیں سے آکر

ابر سے پانی برستا ہے جو قطرہ قطرہ
چشمے بہ بہ کے ہوا کرتے ہیں ضم دریا میں
افتراق اُسکا بھی مٹ جاتا ہے رفتہ رفتہ
موجیں ہوتی ہیں بغلگیر بہم دریا میں

پھول گلشن میں جو کھلتے ہیں الگ شاخوں پر
روز پروان جو یہ چڑھتا چلا جاتا ہے
جھوما کرتے ہیں سحر کو وہ گلے مل مل کر
سرو سورج کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے

کچھ ہوا ایسی چمن کی ہے دلِ بلبل میں
گرمیِ حسن سے گو اُسکی جلے جاتے ہیں
خوفِ صیاد نہیں شوق لگائے گُل میں
پھر بھی پروانے سوئے شمع چلے آتے ہیں

مختلف سمتوں سے چلتی ہیں ہوائیں جتنی
ناز کرتے ہیں پہاڑ اپنی فلک بوسی پر
شوق میں آکے وہ آپس میں ہیں ملتی جلتی
آسماں کرتا ہے اظہار نوازش جھک کر

گھاس کی پتیاں ہیں کاہ رُبا سے چمٹی
برق گرتی ہے جو پانی میں تو رہ جاتی ہے
لوہے کو کھینچتی ہے قوتِ مقناطیسی
پھر پلٹ کر کبھی اُس میں سے نہیں آتی ہے

ہستیاں یونہی ہوا کرتی ہیں باہم یکذات
ایک سے دوسرا ملتا رہے فطرت ہے یہی
اپنے مطلوب سے ملجاتی ہے کُل مخلوقات
کشش و جذب کی دنیا میں حقیقت ہے یہی

ہائے پھر آپ کا یوں مجھ سے جدا ہو جانا
میری تقدیر کا ہے مجھ سے خفا ہو جانا

سوزِ پنہاں

تپشِ دل نے عجب شان بنا رکھی ہے
شررِ عشق نے اک آگ لگا رکھی ہے
آتش افروزیِ اُلفت سے جلا جاتا ہوں
یعنی نذرِ غمِ جانسوز ہوا جاتا ہوں
ایسے احرار بھی ہو جاتے ہیں انسانوں میں
گرمیِ حُسن کی تاثیر ہے اِن شانوں میں

آہ کیسا یہ نکلتا ہے مرے مُنہ سے دُھواں
پھونکے دیتا ہے کلیجہ مرا سوزِ پنہاں
فرطِ سوزش سے ہوئے آبلے پیدا دِل میں
شمع کی طرح گدازی ہے مجھے محفل میں
ایک دریا ہے رواں آٹھ پہر آنکھوں سے
خون بن بن کے ٹپکتا ہے جگر آنکھوں سے

نہ رہا سوزِ دروں شعلۂ پنہاں ہو کر
پردہ پردہ میں چراغِ تہِ داماں ہو کر
ہمہ تن داغ ہوں داغوں سے نمایاں ہوں میں
چشمِ ناظر کے لئے سرو چراغاں ہوں میں
کوئی دنیا میں نہیں سوختہ قسمت مجھ سا
نظر آتا نہیں افروختہ قسمت مجھ سا

آہ کیا برق نگاہی کا تماشا ہے یہی — جل بجھے دیکھنے والا ابھی تقاضا ہے یہی
آگ سینہ میں لگے مُنہ سے مگر اُف نہ کرے — ہاتھ تک جان سے دھو بیٹھے تاسف نہ کرے
اِقتضا ضبط کا گو مانعِ گویائی ہے — چھالے بن کر مرے ہونٹوں پہ فغاں آئی ہے

شرحِ ایں آتشِ جانسوز نگفتن تا کے
سوختم سوختم ایں سوز نہفتن تا کے

دوست کو پیام

یہ عطا کیا ہے تم نے مجھے سوز و ساز کیسا — مرے دل میں بھر دیا ہے غمِ جانگداز کیسا
یہ کشاکشِ تمنا یہ امید کامیابی — یہ تخیلاتِ باطل یہ نمودِ اضطرابی
یہ خلش یہ دردِ پنہاں یہ تڑپ یہ آہ و زاری — یہ ہجومِ آرزو کا یہ وفورِ بیقراری
کبھی بیمِ نامرادی کبھی اشتیاقِ عشرت — کبھی ذوقِ سازگاری کبھی خوفِ یاس و حسرت
کبھی محوِ شادمانی کبھی سوزِ دل سے گریاں — کبھی خود بخود فسردہ کبھی خود بخود پریشاں
کبھی شاکیِ زمانہ کبھی شکوہ سنجِ قسمت — کبھی واصفِ محبت کبھی نکتہ چینِ الفت
نہ ہے چین لمحہ بھر کو نہ سکون ایک دم کو — نہ قرار ہے خوشی کو نہ قیام ہے الم کو

تمھیں لطف کیا ملا ہے مری بیکلی سے آخر
تمھیں ہاتھ آگیا کیا مری بیدلی سے آخر

مرے دل میں تھی تمنّا۔ مرے دل کا مدعا تھا
مرے دل کی آرزو تھی مرا دل یہ چاہتا تھا

تمھیں مجھ پہ رحم آتا مجھے تم بھی پیار کرتے
مرے شیوۂ وفا کو بھی تم اختیار کرتے

مرے دل کا درد سُنتے مرے چارہ ساز ہوتے
مری غمگساری کرتے مرے دلنواز ہوتے

نہ میں اسطرح تڑپتا نہ میں بیقرار ہوتا
نہ یہ اضطراب ہوتا نہ یہ انتشار ہوتا

مری چشمِ خونچکاں سے نہ لہو ہی یوں ٹپکتا
نہ جگر میں آگ لگتی نہ یہ شعلہ یوں بھڑکتا

مجھے کیوں جلا رہے ہو مجھے کیوں ستا رہے ہو
مرے نقشِ زندگانی کو عبث مٹا رہے ہو

تمھیں منصفی سے کہدو یہ ہے طرزِ ناز کیسا
میں نیاز مند ہوں گر تو پھر احتراز کیسا

مرے زخمِ دل کا کچھ تو کبھی التیام ہو جائے
مرے دردِ غم کا اب تو کہیں اختتام ہو جائے

ترانۂ محبّت

(مغربی خیالات کا اقتباس)

جس طرح سمندر کی لہریں ساحل پر سیپ اُچھالتی ہیں
اور بحر میں کرنیں سورج کی اِک نور کی چادر ڈالتی ہیں
یا جیسے فصلِ بہارِ گُل میں بُلبل نغمہ سُناتا ہے
دل میرا جذبِ محبّت سے یوں تیری طرف کھنچ جاتا ہے

یا جیسے نور سے تاریکی اور رات سے دن ہوتا ہی بہم
یا جیسے مِل کر پھولوں کو کرتی ہے تر و تازہ شبنم
یا بیل درختِ بیچاں کی مینارے پر چھا جاتی ہے
ملنے کو تجھ سے روح مری بس جوش میں یونہی آتی ہو

ہوتا ہے مگر تنہا ہی قمر بیمہری سے جلوہ گستر
یا ایک چٹانی غار نہیں آنے دیتا لہروں کو اِدھر
ایسے ہی تیرا جوشِ غضب مجھکو بھی دور ہی رکھتا ہے
اِس حسن کو تیرے رعب ترا گویا مستور ہی رکھتا ہے

جس ظلم سے اور بیرحمی سے یہ رات کا بے پروا پالا
مرجھا کر نازک پھولوں کو کر دیتا ہے رنگ اُن کا کالا
یا جیسے شاہوں کو خنجر کر دیتا ہے دم میں زیرِ خاک
ایسے ہی تیرا جور و ستم مجھکو بھی کئے دیتا ہے ہلاک

گو تجھکو نہ ہو پروا میری یا مجھسے تجھکو نفرت ہے
پر میری رگ رگ کے اندر اُلفت ہے اور محبت ہے

گو طرزِ تغافل سے تیرے میں وقفِ الم ہی رہتا ہوں
پر یوں ہی کہوں گا آیندہ اور اب بھی یہی میں کہتا ہوں

تیرا ہی عاشقِ شیدا ہوں تیرا ہی چاہنے والا ہوں
بس تیرا ہی متوالا ہوں ہاں تیرا ہی متوالا ہوں
تجھسے ہی مجھکو اُلفت ہے دم تیرا ہی میں بھرتا ہوں
ہر حال میں تجھپر مفتوں ہوں جیتا ہوں یا مَیں مرتا ہوں

خاطرِ مایوس

دلکشا قصرِ تمنا تیرا ہر اک باب ہے
واہ کیا پیارا تخیل کیا مزے کا خواب ہے

اے گلستانِ تصور تو بھی کیا شاداب ہے
یہ اگر سچ ہو تو "جنت" عالمِ اسباب ہے

مرتے دم تک دلکشیِ زندگانی ہے یہی
سچ اگر پوچھو حیاتِ جاودانی ہے یہی

آہ نادانستگیہائے دلِ نابردہ غم
سادہ لوحیِ دلِ نادیدۂ رنج والم

سادگیہائے دلِ ناآشنائے فکر وہم
ناشناسئی دلِ ناواقفِ جور و ستم

حُسنِ عالم سوز کا یہ بھی تماشائی ہوا

"بہترینِ آفرینش" کا تمنائی ہوا

آہ! اُمیدِ حصولِ روزگارِ آرزو
خواہشِ نظارگیِ جلوہ زارِ آرزو

دلفریبی ہائے لُطفِ انتظارِ آرزو
اشتیاقِ دیدِ روئے گلعذارِ آرزو

وہ خیالاتِ طرازیٔ جہانِ انبساط
وہ تصور ہائے نیرنگِ زمانِ انبساط

ہم نشینی ہم زبانی کا تصوّرات دن
اسطرح کی زندگانی کا تصوّرات دن

گلفشانی خوش بیانی کا تصوّرات دن
لُطف آغازِ جوانی کا تصوّرات دن

جھینپے جھینپنے سے وہ اندازِ تکلّم کا خیال
دل لگی کا مُسکرانے کا تبسّم کا خیال

عارضِ پُرنور جن پر شمعِ ایماں کا گماں
وہ جبینِ صاف گویا صبحِ صادق ہی عیاں

آئینوالے تا کمر وہ گیسوئے عنبر فشاں
وہ دہانِ تنگ رشکِ غنچہ ہائے بوستاں

اک سراپائے وفا ناز آفریں عشوہ طراز
مستتر ہر ہر ادا میں جسکی شانِ امتیاز

وہ بھی اک تصویرِ اُلفت وہ بھی اک برقِ شرار
شمع بزمِ حسن لیکن سوزِ دل سے اشکبار

غنچۂ خوبی مگر غیرت دہِ عشقِ ہزار
سوختہ جانِ محبت کے لئے پروانہ وار

فلسفہ دانِ محبت واقفِ سرِّ نہاں
اتحادِ جوشِ الفت سے بجانِ جسم و جاں

اضطرابِ شوق اب تابِ شکیبائی نہیں
سامنے کیوں ابتک او طرزِ خود آرائی نہیں

طاقتِ صبر و سکوں اے حسنِ زیبائی نہیں
بہرہ مندِ انوار سے چشمِ تماشائی نہیں

آرزوؤں سے تمناؤں سے ارماں ہیں ہم
یا خدا نا خواستہ اُمید و حرماں ہیں ہم

آہ فرطِ آرزو بیکار ہی جائے گی کیا
رنگ میری بدنصیبی کچھ نیا لائے گی کیا

یہ تمنا بن کے حسرت خون رُلوائیگی کیا
میرے ارمانوں پر آخر مُردنی چھائیگی کیا

آہ کیا ہو جائیگا سچا یہ میرا احتمال
بس زیادہ دے نہ دھوکے مجھکو نیرنگِ خیال

آہ یہ تو ہی مرے آغازِ الفت کا سماں
آہ یہ تو ہیں مری گذری ہوئی دلچسپیاں

آہ یہ تو ابتدائے شوق کی ہیں سنریاں
آہ یہ تو ہیں مری پہلی خیالی ہستیاں

باغِ دل میں جبکہ آتی تھی بہارِ آرزو
اور میں تھا عندلیبِ شاخسارِ آرزو

شانِ استغنائیِ جاناں کسے معلوم تھی
شورہ بختیِ تہیدستاں کسے معلوم تھی

نامرادیِ دلِ ناداں کسے معلوم تھی
یہ روش اے گردشِ دوراں کسے معلوم تھی

آہ اے گردونِ گرداں آہ اے دورِ زماں

آہ نیرنگیٔ دہر و انقلابِ آسماں

آہ وہ میری اُمنگیں وہ اُمیدوں کا وفور — وہ تمناؤں کا مجمع حسرت و حرماں سے دور
اضطرابِ شوق میں جوشِ طبیعت کا ظہور — ہلکا ہلکا بادۂ جامِ محبت کا سرور

آہ وہ شوقِ نظارا آہ وہ ذوقِ جمال
آہ وہ لطفِ تصور آہ وہ حسنِ خیال

مٹ گئے وہ داغہائے پرشرارِ حُسن و عشق — اُڑ گئے گلہائے باغِ نوبہارِ حُسن و عشق
ہوگیا تصویرِ حسرت بیقرارِ حُسن و عشق — یاس نے رکھا نہ ارشد زیرِ بارِ حُسن و عشق

اب کہاں وہ جامِ کیفِ خوشگوارِ آرزو
اب کہاں وہ سرخوشی ہائے خمارِ آرزو

بیانِ آرزو

یا الٰہی کیا ہوئی وہ میری شانِ آرزو — اب کہاں جاتی رہی وہ این و آنِ آرزو
وہ مری شامِ تمنا وہ مری صبحِ اُمید — وہ مرے اوقاتِ فرصت وہ زمانِ آرزو
اشتیاقِ منزلِ مقصود و جوشِ اضطراب — وسعتِ دشتِ خیال و کاروانِ آرزو
وہ تبسم خیز موجیں بحرِ حُسنِ فکر کی — کشتیٔ دل اور اُس پر بادبانِ آرزو
کامیابی کی وفورِ شوق میں خوش منظری — جو مدارِ زندگی تھی اور جانِ آرزو

سازگاریِ مقدر کا وہ لطفِ انتظار — یعنی اک کیفیتِ رازِ نہانِ آرزو

ہاں مگر محرومیٔ قسمت کا تھا یہ انتخاب — اک متاعِ داغ ہے سود و زیانِ آرزو

آہ اے ناکامیٔ جاوید یہہ کیا کر دیا
ہو کے بے بس رہ گیا اک ناتوانِ آرزو

آگئی بزمِ تمنا پر قیامت آگئی — گر پڑا ہے ٹوٹ کر اک آسمانِ آرزو

انتہائے یاس نے سکتہ کا عالم کر دیا — محشرستانِ تحیر ہے جہانِ آرزو

کیسی کیسی حسرتوں کا خوں ہوا ہی کیا کہوں — شرحِ درد و غم ہے میری داستانِ آرزو

وہ اُمیدیں وہ اُمنگیں وہ تمنائیں وہ شوق — دل سے کیونکر مٹ گیا اک اک نشانِ آرزو

نامرادی نے کیا ہے اسقدر پستی نصیب — وہم سے بھی ہو گیا بالا گمانِ آرزو

دائمی افسردگی چھائی ہوئی ہے ہر طرف — بنگیا جوشِ طرب بھی ہم عنانِ آرزو

خارزارِ حسرت و حرماں دلِ پژمردہ ہے — ہو گیا صرفِ خزاں یہ بوستانِ آرزو

اس ہجومِ یاس میں بھی لے دلِ خمیازہ کش
اور باقی ہے ابھی کچھ امتحانِ آرزو

آہ عالم ناامیدی کا بھی کیا تاریک ہی — اب کہاں وہ پرتوِ حسنِ عیانِ آرزو

اب کہاں وہ دلفریبی اور وہ دلبستگی — اب کہاں وہ دلکشیِ جاودانِ آرزو

خانۂ خالی میں ویرانی ہی کیا چھائی ہوئی — ہائے میرا دل کبھی تھا میزبانِ آرزو

نارسائیِ مقدر سے مٹا جاتا ہے یہ — آہ شوقِ جبہ سائے آستانِ آرزو

کر دیا تصویرِ حیرت فرطِ حسرت نے مجھے
اب کہاں وہ گرمیِ حسنِ بیانِ آرزو

سوزشِ پنہاں کا لب تک آ نہیں سکتا گلہ
شمع کی مانند جلتی ہے زبانِ آرزو

پھر بھی اس لطفِ خلش کو کیا کہوں کیا کچھ ہی یہ
دل میں چبھ کر رہ گئی نوکِ سنانِ آرزو

مرتے مرتے بھی نہیں جاتی ہیں یہ دلچسپیاں
ایسے لذت گیر ہیں دلدادگانِ آرزو

ناامیدی میں بھی ہوں امیدوارِ آرزو
آہ کچھ پوچھو نہ ذوقِ انتظارِ آرزو

دیدے یارب پھر وہی لیل و نہارِ آرزو
گردشِ ایام لادے روزگارِ آرزو

پھر کہیں سے مجھکو ملجائے مرا عہدِ عتیق
جس نے دے رکھا تھا مجھکو افتخارِ آرزو

اخترِ قسمت چمک جائے پھر آئیں میرے دن
نور افگن ہو وہی شمس النہارِ آرزو

پھر ہری ہو کر پھلے پھولے مری کشتِ امید
گلشنِ دل میں پھر آجائے بہارِ آرزو

پھر مرے دل میں تمناؤں کی ہو بزمِ نشاط
پھر وہی جوشِ طرب جو ہے شعارِ آرزو

پھر وہی سرمستی و وجدانِ بزمِ بیخودی
پھر وہی جامِ شرابِ خوشگوارِ آرزو

یاد ہیں وہ ابتدائے شوق کی کیفیتیں
چاہتا ہوں پھر وہی ارشد خمارِ آرزو

میری عید

دن عید کا ہے آج نیا رنگِ جہاں ہے
چھایا ہوا ہر سمت مسرّت کا سماں ہے

پھرتی ہے خوشی چار طرف رقص کناں آج
آتا ہے نظر شاد ہر اک پیر و جواں آج

چہروں پہ بشاشت ہے لبوں پر ہے تبسّم
کانوں میں ہے آوازۂ عشرت کا ترنّم

بچّوں کی مسرّت ہی عیاں شور و شغب سے
وہ پھولے سماتے نہیں افراطِ طرب سے

کلفت کا زمانہ میں نہیں نام و نشاں تک
اندوہ کا شمّہ بھی نہیں وہم و گماں تک

عشاق کا بھی غنچۂ دل آج کھلا ہے
اب جور کا شکوہ نہ تغافل کا گلا ہے

کہتی ہے تمنّاؤں سے اُمّید مبارک
ہو عید کے ہمراہ تمہیں دید مبارک

عذرات وفاؤں کے قدم چوم رہی ہیں
مل مل کے گلے دونوں بہم جھوم رہی ہیں

اک مَیں ہوں کہ ہوں آج بھی افسردہ و دلگیر
سب عیش کی تصویریں ہیں میں رنج کی تصویر

آنکھوں میں وہی اشک وہی لب پہ فغاں ہے
دل میں ہے وہی درد وہی سوزِ نہاں ہے

خمیازۂ امید وہی پیشِ نظر ہے
ناکامیِ جاوید وہی پیشِ نظر ہے

آشفتگیِ بخت کا عالم بھی وہی ہے
آہیں ہیں وہی نالۂ پیہم بھی وہی ہے

صدمہ بھی وہی اور وہی جوشِ جنوں ہے
آلام کی کثرت سے وہی حالِ زبوں ہے

اندازۂ شوریدہ سری بھی ہے وہی آج
ہے اب بھی وہی صورتِ زیبائشِ مژگاں
ویسا ہی حزیں اب بھی ہوں لب خشک ہیں منہ زرد
نالوں میں ہے تاثیر نہ آہوں میں اثر ہے

پہلو میں گدازِ جگری بھی ہے وہی آج
ٹکڑے جگر و دل کے ہیں آرائشِ مژگاں
رہ رہ کے وہی بھرتا ہوں میں اب بھی دمِ سرد
نیرنگیِ قسمت سے وہی شام و سحر ہے

نومیدیِ ما گردشِ ایام ندارد
روزے کہ سیاہ شد سحر و شام ندارد

دلِ ناکام

لطفِ آغازِ محبت کی کہانی کیا کہوں
کس قدر دلکش تھی میری زندگانی کیا کہوں

ہو گئیں باتیں ہی یہ اب تو پرانی کیا کہوں
دل کے وہ جذبات اور شوقِ نہانی کیا کہوں

تھا ہجومِ شوق سے میں بھی تمنائی کبھی
ہاں تصور ہی میں رہتا تھا تماشائی کبھی

تھا کبھی میرے لئے بھی رزگارِ آرزو
جوشِ دل سے ہو نہ سکتا تھا شمارِ آرزو

مجھکو بھی حاصل تھا لطفِ انتظارِ آرزو
آرزو مجھ پر فدا تھی میں نثارِ آرزو

مخزنِ صد آرزو میرا دلِ ناکام تھا
ناامیدی میرے آگے ایک فرضی نام تھا

بزمِ مینوشاں میں میرا بھی کبھی مذکور تھا
میں بھی کیفِ جامِ اُلفت سے کبھی مسرور تھا
میری قسمت میں بھی یہ افشردۂ انگور تھا
میں بھی صہبائے محبت سے کبھی مخمور تھا
ملتفت پیرِ مغاں تھا دور میں پیمانہ تھا
مَیں بھی تھا میکش کبھی مشرب مرا رندانہ تھا

آہ تھا میرا زمانہ بھی کبھی دورِ نشاط
آہ شوقِ گرمجوشی آہ ذوقِ ارتباط
اور مستقبل نظر آتا تھا پُر از انبساط
وہ تمنائے تکلم آرزوئے اختلاط
مجھسے پوچھے کوئی اُس اُمید عشرت کے مزے
وہ وفورِ شوق وہ فرطِ مسرت کے مزے

کیا خبر تھی یوں بھی نیرنگِ جہاں ہو جائیگا
ایکدم سے منقلب دورِ زماں ہو جائیگا
اس طرح کا انقلاب ناگہاں ہو جائیگا
اپنے ارمانوں کا دشمن آسماں ہو جائیگا
اوس پڑ جائیگی میرے گلشنِ اُمید پر
حسرتیں روئیں گی اس ناکامیِ جاوید پر

میں سمجھتا تھا کہ ہیں میرے لئے امکانِ عیش
میں بھی کر لونگا فراہم ایکدن سامانِ عیش
دستِ کوشش سے پکڑ سکتا ہوں میں دامانِ عیش
کیا کہوں دل میں تھے کیا کیا کچھ مرے ارمانِ عیش
آہ۔ گوناگونیاں میرے دلِ ناکام کی
آہ بوقلمونیاں آغازِ بدانجام کی

وہ سہانی شام میری رات وہ تاروں بھری
صبحِ صادق کو افق سے مہر کی جلوہ گری

کیسی کچھ خوشخبریاں دیتی تھی یہ خوش منظری
وہ طبیعت کی اُمنگیں اور شگفتہ خاطری

آہ یہ کیا ہو گیا وہ دن وہ راتیں اب کہاں
وہ تخیّل وہ تصوّر اور وہ باتیں اب کہاں

آہ یہ کیا کر دیا اے گنبدِ نیلوفری
آہ گردش کی یہ کیسی تو نے چرخِ چنبری
آہ کیسا رنگ لائی مری بداختری
آہ کیسی جل گئی اُمیّد کی کھیتی ہری

اب کہاں وہ دلفریبی ہائے اُلفت کے مزے
اب کہاں وہ دلکشی ہائے محبّت کے مزے

آہ وہ دل جو کہ شیدائے رُخِ پُر نور تھا
آہ وہ دل جو کبھی رشکِ چراغِ طور تھا
آہ وہ دل بادۂ اُلفت سے جو مخمور تھا
آہ وہ دل جسکے ہاتھوں میں بہت مجبور تھا

آہ وہ دل جو کہ اُمیّدوں کا اک کاشانہ تھا
آخرش دیکھا تو ارمانوں کا زنداں خانہ تھا

وہ تصوّر کا کسی کے مشغلہ جاتا رہا
گیسوئے پُر پیچ و خم کا سلسلہ جاتا رہا
وہ تمنّا مٹ گئی وہ حوصلہ جاتا رہا
رہ گئی حسرت ہی حسرت ولولہ جاتا رہا

اب ہجومِ یاس ہے اور کثرتِ آلام ہے
میں ہوں ارشد اور اک میرا دلِ ناکام ہے

صیدِ تمنّا

وہ صبحِ مسرّت وہ مری شامِ تمنّا کیا ہو گئے "ہے ہے" مرے ایامِ تمنّا
تھیں آرزوئیں چار طرف سے مجھے گھیرے ہر وقت زباں پر تھا مری نامِ تمنّا
ارمان ہزاروں ہی بھرے رہتے تھے دلمیں لبریز خوشی سے تھا مرا جامِ تمنّا
آتی تھیں طبیعت میں اُمنگیں مرے کیا کیا کیا حوصلے رکھتا تھا میں ہنگامِ تمنّا
کیفیتیں حاصل تھیں مجھے خودبخود ایسی تھا جرعہ کشِ بادۂ گلفامِ تمنّا
ہمّت کی بلندی سے سمجھتا نہ تھا میں کچھ اونچا نظر آتا نہ تھا کچھ بامِ تمنّا
یہ جانتا تھا کاتبِ قسّامِ ازل نے قسمت میں لکھا ہے مری آرامِ تمنّا
تھی شیخ سے رغبت نہ برہمن سے تھا کچھ بیر تھے کعبۂ دل میں مرے اصنامِ تمنّا
تھا شاہدِ اُمید کا جلوہ طرب افزا خاطر میں نہ آئے کبھی آلامِ تمنّا
ہر پہلوئے نازک تھا مرے ذہنِ رسا میں عائد کوئی ہوتا نہ تھا الزامِ تمنّا
ناکامیِ قسمت کی مگر تھی نہ خبر کچھ معلوم نہ تھا ہوگا یہ انجامِ تمنّا
آشفتگیِ بخت دکھائے گی دن ایسا ہو جاؤنگا یوں کشتۂ صمصامِ تمنّا
یوں شوق مبدّل بہ حسرت سے کسی کا دُنیا میں نہ ہو یوں کوئی ناکامِ تمنّا
اس بیکسیِ درد سے دے جان نہ کوئی پھانسے نہ کسی کو طمعِ خامِ تمنّا

ارشد جو غمِ یاس سے دم توڑ رہا ہے
اک طائرِ بسمل ہے تہِ دامِ تمنّا

افسردۂ خاموش

اے ہمدم سے ہائیں یہ تیری حالت کو کیا ہوا
کیا ہو گیا ہے کیوں یہ ترا چہرہ زرد ہے
مردِ خدا بتا تو سہی کیا خیال ہے
چُپ سادھنی یہ تیری مروت سے دور ہے

ارشد شگفتگیِ طبیعت کو کیا ہوا
خاموش کیوں ہی ہونٹوں پہ کیوں آہ سرد ہے
کچھ مُنہ سے بول کس لئے اتنا ملال ہے
احباب کو تو حال بتانا ضرور ہے

عمرِ دو روزہ قابلِ سوز و گداز نیست
ایں رشتہ را مسوز کہ چنداں دراز نیست

اے ہم نشیں نہ پوچھ مری داستانِ غم
ہم کشتگانِ یاس کا حالِ زبوں نہ پوچھ
واماندگانِ عشق کی درماندگی نہ سُن
سوزِ تپِ فراق کی حالت نہ پوچھ تو

ہو مبتلائے رنج نہ سُنکر بیانِ غم
پھونکا ہے جس نے دلکو وہ سوزِ دروں نہ پوچھ
آشفتگانِ بخت کی ناسازگی نہ سُن
ناکامِ اشتیاق کی حالت نہ پوچھ تو

ناشاد و نامراد کی مت پوچھ سرگذشت
اُفتادہ فتاد کی مت پوچھ سرگذشت

مارا ہوا ہوں مَیں ستمِ روزگار کا
پیسا ہوا ہوں گردشِ لیل و نہار کا

نیرنگیِ فلک کا ستایا ہوا ہوں مَیں
قسمت کی اُلجھنوں کا پھنسایا ہوا ہوں مَیں

خوں کردۂ اُمیدِ دلِ ناصبور ہوں
گم کردہ راہ منزلِ مقصد سے دور ہوں

آشفتگیِ بخت سے ناسازگار ہوں
باغِ خزاں رسیدۂ قبل از بہار ہوں

ناکامِ آرزوئے جمالِ حبیب ہوں
مَیں ابتدائے شوق میں حرماں نصیب ہوں

مانوس درد و غم سے الم سے فغاں سے ہوں
مایوس زندگی سے ہوں آزردہ جاں سے ہوں

پھرتا نہیں ہوں گلشنِ شاداب میں کبھی
جاتا نہیں ہوں مجمعِ احباب میں کبھی

صحرا سے ہی لگاؤ نہ صحنِ چمن کا شوق
خلوت کا خواستگار نہ کچھ انجمن کا ذوق

ہنگامہ زارِ ہستی سے بالکل نفور ہوں
ہاں اب مَیں اپنے آپ سے بھی کوسوں دور ہوں

آخر ز راہ و رسمِ جہاں بیخبر شدم
رنگِ زمانہ دیدہ برنگِ دگر شدم

اب سر سے پاؤں تک میں کوئی اور ہو گیا
جاتی رہیں وہ باتیں نیا طور ہو گیا

پہلی سی وہ خیال کی پرواز ہی نہیں
اگلا سا مجھ میں اب کوئی انداز ہی نہیں

وہ ولولہ وہ جوش وہ ہمت نہیں رہی
وہ مَیں نہیں رہا وہ طبیعت نہیں رہی

چپ چاپ بیٹھا رہتا ہوں تصویر کی طرح
باقی نہیں وہ شوخیِ تحریر کی طرح

شد صرفِ سوزِ عشق بیانے کہ داشتم
مانندِ شمع سوختہ زبانے کہ داشتم

پایانِ اُلفت

کیا کہوں میرا عجب حال ہوا جاتا ہے
اب تو جینا مجھے جنجال ہوا جاتا ہے

نہ پراگندہ طبیعت نہ سکونِ دل ہے
بیخودی کہتے ہیں جسکو نہ وہی حاصل ہے

نہ کسی چیز کی خواہش نہ تمنّا کوئی
مدعا ہے کوئی دل کا نہ تقاضا کوئی

ساری دنیا میں کسی سے بھی سروکار نہیں
مجھکو کچھ عالمِ اسباب میں درکار نہیں

وہ اُمنگیں ہی طبیعت میں نہیں جوش نہیں
الغرض مجھکو کسی بات کا بھی ہوش نہیں

ڈھنگ ہی اب تو نرالا ہے نیا عالم ہے
نہ مسرّت کا اثر ہے نہ وفورِ غم ہے

بولتا بھی نہیں میں اور نہ خاموش ہوں میں
کُل بکھیڑوں سے زمانہ کے سبکدوش ہوں میں

نہ کسی حُسنِ دلاویز کی اُلفت باقی
نہ حسینوں سے رہی مجھکو محبّت باقی

شکوۂ جور نہ اظہارِ وفا کوشی ہے
بیقراری بھی نہیں ہے نہ فراموشی ہے

صدمۂ ہجر سے جینا مجھے دشوار نہیں
دلکو کچھ روگ نہیں اب مرے آزار نہیں

مجھکو پروا بھی نہیں گر وہ بُلاتے بھی نہیں
میں تڑپتا بھی نہیں گر وہ ستاتے بھی نہیں

خالِ مشکیں نہیں بنتا ہے سویدا دل میں
اُلجھنیں زُلف سے ہوتی نہیں پیدا دل میں

کوئی اندازِ تغافل بھی مجھے شاق نہیں
بیحجابی کا رُخِ یار کی مشتاق نہیں

اب نہ پیماں شکنی کا مجھے غم ہوتا ہے
کوئی کاوش نہیں ہوتی نہ الم ہوتا ہے

گر تصور میں کبھی وہ مرے آ جاتے ہیں
اور گزری ہوئی کو یاد دلا جاتے ہیں

آہ بےساختہ اک مُنہ سے نکل جاتی ہے
پھر اسی آہ کے کرنے پہ ہنسی آتی ہے

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہوا کیا مجھکو
آپ اپنا نظر آتا ہے تماشا مجھکو

میرا عنواں ہے عجب شان سے زیبِ ہستی
محوِ نظارۂ تصویر فریبِ ہستی

نگہِ یاس ہوں میں دیدۂ حیراں ہُوں میں
خون صد آرزو و حسرت وارماں ہُوں میں

دردِ دل کا مرے مستغنیٔ درماں ہونا
چارہ سازوں کا بتاتا ہے پشیماں ہونا

گزری کیا کچھ مرے دل پر یہ کوئی کیا جانے
میری قسمت ہی میں چکر ہے کوئی کیا جانے

نہیں معلوم کسی کو مرے دل کی حالت
نہیں معلوم کسی کو بھی مری کیفیت

کیا سبب جانے کوئی میری پریشانی کا
کس نے اندازہ کیا غم کی فراوانی کا

ایسی تاریک نظر آتی ہے دُنیا مجھکو
کہ ذرا بھی نہیں جینے کی تمنا مجھکو

ارشد اب اپنے تصور سے بھی بیگانہ ہوں
اور لوگوں نے سمجھ رکھا ہے دیوانہ ہوں

تصویرِ غم

مَیں ہستی اِک افسردہ ہُوں
باغِ جہاں میں پژمردہ ہُوں

درد ہوں لیکن بے درماں ہوں
مِٹ جانے والا ارماں ہوں

حرفِ مروت رنگِ وفا ہوں
خوگیرِ تسلیم و رضا ہوں

خاکِ کوئے اُلفت ہوں میں
ذرّۂ دشتِ محبّت ہوں میں

طرزِ چاکِ گریباں ہوں میں
رنگِ خونِ شہیداں ہوں میں

ہوں ناکامِ تمنّا یعنی
بد انجامِ تمنّا یعنی

میری مرادیں کیا بر آئیں
آرزوئیں کیا دل میں سمائیں

غنچۂ دل کیا ہو شگفتہ
میں ہی جب خود ہوں آشفتہ

اُلجھے کیوں نہ طبیعت میری
برگشتہ ہے قسمت میری

محوِ سوز و سازِ غم ہوں
وقفِ فرطِ رنج و الم ہوں

یاس ہے مونس حرماں ہمدم
شغل ہے میرا نالۂ پیہم

چین نہیں ہے ایک منٹ بھی
رشتۂ عمر کہیں تو کٹے بھی

جان سے جاؤں غم سے چھوٹوں
روز کے رنج و الم سے چھوٹوں

اس جینے سے مرنا اچھا
جان سے اپنی گزرنا اچھا

زندہ بہرِ رنج و تعب ہوں
نامانوسِ عیش و طرب ہوں

مجھکو مسرّت پا نہیں سکتی
مجھکو خوشی بہلا نہیں سکتی

حیراں خامش زار و حزیں ہوں
ہوں ایسا گویا کہ نہیں ہوں

دل ہے سیر جہاں سے اب تو
تنگ ہوں جسم و جاں سے اب تو

زیست سے اپنی آزردہ ہوں
میں تو جیتے جی مردہ ہوں

حُسنِ اجل

روئے پنہاں کا ترے میں بھی ہوں شیدا اے موت
حُسنِ مستور کا ہوں محوِ تمنا اے موت

تیرے اندازِ خموشی پہ فدا ہوں میں بھی
یعنی دلدادۂ نیرنگِ قضا ہوں میں بھی

چین لینے نہیں دیتی تپشِ دل مجھکو
خوں رُلواتی ہے اب تو خلشِ دل مجھکو

طاقتِ زیست نہیں جینے کا یارا ہی نہیں
اور مرنے کے سوا کچھ مجھے چارہ ہی نہیں

اب بہت تجھ سے مجھے شوقِ ہم آغوشی ہے
فارغ الدہر ہوں دُنیا سے فراموشی ہے

مجھکو منت کشیٔ اہلِ جہاں راس نہیں
اے اجل تیری عنایت ہے مگر یاس نہیں

تو ہر اک درد و مصیبت سے بچا دیتی ہے
گوشۂ قبر میں خاموش سُلا دیتی ہے

سارے دُنیا کے چھڑا دیتی ہے افکار سے تو
کام کرتی ہے مسیحائی کا بیمار سے تو

جس کا چارہ نہ ہو اُس درد کا درماں ہے تو
جن پہ مشکل ہو جہاں ایسوں پہ آساں ہے تو

بیقراروں کے لئے باعثِ آرام ہے تو
اہلِ فرقت کے لئے شاہدِ گلفام ہے تو

تیرے مفتوں ہیں بد انجام زمانہ بھر کے
تیرے ممنون ہیں ناکام زمانہ بھر کے

کس مپرسی میں ہی سرتاپا نوازش تری ذات
نامرادوں کے لئے مایۂ نازش تری ذات

تو ہے اللہ سے بندوں کو ملانے والی
بے ٹھکانوں کو ٹھکانوں سے لگانیوالی

دیکھ لی روئے منور کی ترے جس نے جھلک
بیخودی نے نہ سنبھلنے دیا پھر حشر تلک

شانِ احسان و کرم اپنی دکھائی تو نے
ہر گرفتار کو بخشی ہے رہائی تو نے

قیدِ تن سے اُسے آزادی جو مل جاتی ہے
روح کس ناز سے اِتراتی ہوئی جاتی ہے

قدر ہوتی ہے ترے آنے سے انسانونکی
منزلت دیکھئے گزرے ہوئے افسانونکی

جتنے ہو گزرے ہیں اس دہر میں اربابِ کمال
زندگی میں نہ کسی نے بھی کیا اُنکا خیال

بعد مرنے کے وہی عرش کے تارے بنکر
فلکِ عظمت و رفعت پہ ہیں جلوہ گستر

تجھ سے اے موت ہے دُنیا کا تمدن قائم
تو نہ ہو گر تو جہاں ہو ابھی درہم برہم

معتدل عالمِ انسان ہے تیرے دم سے
ہستیٔ مذہب و ایمان ہے تیرے دم سے

شمع

اے چراغِ طورِ حسن۔ اے جلوۂ نظارہ سوز
جانِ پروانہ تماشا گاہِ عشقِ عالم فروز

سوختہ جانِ محبت ناظرِ روئے صنم
شمع سوزاں یعنی اے روشنگرِ دیر و حرم

محفلِ عیش و طرب کی شان بالا تجھ سے ہے
تیرگیٔ شامِ غم میں بھی اُجالا تجھ سے ہے

نور افگن بزمِ جاناں میں رہا کرتی ہے تُو
جلوہ فرما قصر و ایواں میں ہوا کرتی ہے تُو

تیرے دم سے شب کو قائم گرمیٔ بازار ہے
روشنی میں تیری کُل دُنیا کا کاروبار ہے

تیری شانِ جلوہ افروزی ہے نورِ زندگی
روئے پُر تنویر کی عالم میں ہے تابندگی

تو ہے ساتھی منزلِ مقصود تک انسان کی
عالمِ ہُو میں ہے زینت تجھ سے گورستان کی

قبرِ بیکس پر یہ تیری جھلملاتی روشنی
ڈالتی ہے بے ثباتی پر جہاں کی روشنی

آہ - اے شمعِ لحد - اے رونق افزائے مزار
مرنیوالوں مٹنے والوں بیکسوں کی سوگوار
یہ خموشانِ اجل پر آہ و زاری کس لئے
جانگدازی سینہ سوزی اشکباری کس لئے
کیوں گھُلی جاتی ہے فرطِ غم سے اے مایوس تو
اِن عدم کے جانیوالوں سے ہے کیا مانوس تو
کشمکش ہائے جہاں کی اُلجھنوں کو چھوڑ کر
آئے ہیں ہنگامہ زارِ دہر سے مُنہ موڑ کر
خفتگانِ خاک کی کرتی ہے کیوں تو جستجو
کشتگانِ یاس سے کس بات کی ہے آرزو
ان کے دل بھی مر گئے اور حسرتیں بھی مر گئیں
خاک ہو کر سب تمنّائیں کنارہ کر گئیں
تو شروعِ زندگی ہی سے ہے گریہ کناں
بعدِ مردن بھی سرِ مرقد ہے خوننابہ فشاں

ہاں مگر انجامِ ہستی کا تجھے معلوم ہے
ابتدا میں انتہا کے واسطے مغموم ہے

دولت و شہرت

دُنیا کی دولت ! دُنیا کی شہرت !
کیا ہیں یہ دونوں بنیادِ عشرت ؟
دے سکتی ہیں کیا تم کو یہ راحت ؟
کیا ان سے پاؤ گے لطفِ بہجت ؟

کیا اِن سے حاصل ہو گی مسرت؟
شاید جواب اس کا دو گے ہاں میں

دُنیا میں لیکن شہرت کا سہرا
کیسی ہی خوشبو دے وہ زیادہ
آخر ہے اک دن مُرجھانے والا
کتنا ہی پیارا ہو اور اچھا
جس سے مشامِ عالم ہو تازہ
کیا وہ بچے گا فصلِ خزاں میں

یہ مال اسباب یہ سیم یہہ زر
یہ بیش قیمت دھات اور پتھر
اچھے تو سمجھے جاتے ہیں اکثر
یہہ سچے موتی لعل و جواہر
عمدہ سے عمدہ بہتر سے بہتر
داخل ہے یہ سود لیکن زیاں میں

کرلیں اگر فرض اک شخص ایسا
شانِ امارت میں بھی ہے یکتا
آخر کسی دن وہ بھی مرے گا
رکھتا بہت سا ہے وہ خزانہ
دبتے ہیں اُس سے ادنیٰ و اعلیٰ
ہو گی جدائی جسم اور جاں میں

اک مطربہ کی یا شاعرہ کی
عزّت ہے کرتی ہر قوم اُس کی
ہو گی فنا پر اُس کی بھی ہستی
شہرت ہے ساری دنیا میں پھیلی
آنکھوں میں دل میں سب نے جگہہ دی
تھی ہی نہیں وہ گویا جہاں میں

قابل مصنف ہے ایک ایسا
مانا گیا ہے بے مثل و یکتا
بکھرے گا پھر بھی شیرازہ اُسکا

زورِ قلم کا جس کے ہے چرچا
تحریر اُس کی ہے فخرِ اَنشا
وقت پڑے گی نام و نشاں میں

دُنیا کی دولت! دُنیا کی شہرت
دُنیا کی ثروت! دُنیا کی حشمت
دُنیا کی عظمت! دُنیا کی وقعت

دُنیا کی عزت! دُنیا کی حُرمت
دُنیا کی رفعت! دُنیا کی شوکت
منتظر ہیں یہ سب خوابِ گراں میں

وفائے گُل

پیڑ ہے گھر میں گُلِ عبّاس کا
گو نہیں دیتا ہے بو مثلِ گلاب
پھر بھی اُس سے لُطف اک پاتا ہوں میں
گو نہیں تعریف کے قابل ہیں پھول
دیکھتا رہتا ہوں میں اُنکی بہار
عطر ان کا گو نہیں کھنچتا کہیں
ہو نہ بُلبل ملتفت ان پر ہزار
گو حسیں رکھتے نہیں سر پر انہیں

نام کچھ اُس میں نہیں بو باس کا
گھر نہیں ہوتا ہے میرا مشکناب
سادگی سے دل کو بہلاتا ہوں میں
پر نہیں ہوتا ہے دل میرا ملول
گھر بنا رہتا ہے میرا لالہ زار
ہے مگر تازہ مری جانِ حزیں
میں انہیں کرتا ہوں لیکن دل سے پیار
میں سمجھتا پھر بھی ہوں بہتر انہیں

گو نہیں انکے بناتے لوگ ہار — پھر بھی ہوں سو جاں سے میں ان پر نثار
گو بناتے ان کے گلدستے نہیں — ان سے ملبوسات بھی بنتے نہیں
ہیں مگر پھر بھی یہ میرے کام کے — لُطف دینے والے صبح و شام کے
میرے دل سے کوئی پوچھے انکی شان — مجھ سے سُن لے کوئی انکی آن بان
موگرا۔ بیلا۔ چمیلی۔ موتیا — بے تکلف اِن پہ میں کر دوں فدا
سامنے کیا ان کے جچتا کیا گلاب — ہیں یہ دُنیا بھر کے پھولوں کا جواب
ساری دنیا سے یہ ہیں مجھکو عزیز — میں سمجھتا ہوں کہ ہیں یہ کیسی چیز
کیوں نہ ہو پودا ہے کس کے ہاتھ کا — ہائے جو کھیلا ہوا تھا ساتھ کا
خاک میں اکبار جا کر مل گیا — پھر نہ اپنا کچھ پتا مجھکو دیا
یہ گلِ عباس بھی ہاں خاک میں — ہر برس جاتا ہے اُسکی تاک میں
فرطِ غم سے زار ہے میری طرح — اشتیاقِ یار ہے میری طرح
یا مجھے فرقت میں پاکر بیقرار — اُس سے کرتا ہے یہ جاکر آشکار
ہجر میں تیرے نہیں ارشد کو کل — ”خاک سے میری طرح تو بھی نکل“
چُل تسلی دے دلِ مہجور کو — ”شاد کر دے خاطرِ رنجور کو“
خوب واقف ہوں میں اسکے حال سے — دیکھتا ہوں یوں اسے دو سال سے
جب خزاں کا آکے ہوتا ہی اثر — پیڑ۔ پتے۔ پھول جاتے ہیں بکھر
جب یہ چھاتا ہے زمانہ پر سماں — پیڑ ہو جاتا ہے مِٹی میں نہاں

دیکھتا ہے پھر وہاں یہ انتظار
یہ بگڑنا اسکا پھر بنجانا ہے
جب خزاں جاکر پھر آتی ہے بہار
اسکو ہے مصداق ہونا بیش و کم
الغرض جو کچھ بھی ہو یہ خوب ہے
ہے سراپا خوگرِ مہر و وفا

میں بھی نکلوں کاش آجاے بہار
ہاے کیا انداز معشوقانا ہے
تب نکلتا ہے یہ بعد از انتظار
"ہفت صد ہفتاد قالب دیدام"
یہ مرا یو دا بمجھے مرغوب ہے
بھولتا مجھکو نہیں بعدِ فنا

شاد اس سے خاطرِ مغموم ہے
یہہ نشانِ مشفقِ مرحوم ہے

دشتِ غربت

دشتِ غربت میں مسافر کو وطن یاد آیا

ستمبر ۱۹۱۰ء کے اصلاحِ سخن میں تصویرِ فیاض اور جناب مظہر تھانوی و عیش وغیرہ کی غزلیات پرانی صحبتوں کی دلچسپیاں یاد دلانے کا باعث ہوئیں۔ برسوں بعد تخیل نے وطن کی گزشتہ پرلطف سنیریوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچدیا اُسی زمانہ میں کسی دوست نے ایک شعر کہا تھا ؎

ہم ہیں تھانہ بھون کی گلیاں ہیں
یار لوگوں کی رنگ رلیاں ہیں

مگر مدت ہوئی یار لوگوں کا یہ مجمع منتشر ہو گیا۔ البتہ دلوں پر تصویریں کھچی ہوئی ہیں۔

یہ مورت حرم میں جڑی رہ گئی

فکرِ موزوں نے اُس واپس نہ آنے والے منظر کی طرف سرسری نظریں دوڑائی ہیں اور حُبِ وطن کے جذبات کو نظم کی صورت میں ظاہر کیا ہے۔ اشعار ذیل اس تمہید کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسی خاص نقطۂ نگاہ سے دیکھے جانے کے مستحق ہیں۔

او وطن کی سرزمیں او خطۂ رشکِ چمن
رو کشِ فردوس یعنی قصبۂ **تھانہ بھون**

او مری طفلی کی دنیا میرے بچپن کے جہاں
میرے جانے میرے بوجھے او زمین و آسماں

جب رہا کرتا تھا تجھ میں کسقدر دلشاد تھا
میں زمانہ بھر کی ہر اک فکر سے آزاد تھا

وہ ترے شاداب جنگل وہ ترے سرسبز باغ
پُر فضا وہ تیری بستی جسمیں حاصل تھا فراغ

تیری گلیوں میں عجب ملتی تھی فرحت اُن دنوں
ساری دُنیا سے فزوں تھی تیری وسعت اُن دنوں

تیرے دامن میں تری گودوں میں بڑھتا بھی رہا
کھیلتا بھی۔ کودتا بھی اور پڑھتا بھی رہا

رفتہ رفتہ ایک منظر اور دلکش آگیا
کیا سماں تھا جس کا عالم چشم دل پر چھا گیا

آہ ۔ ابتک یاد ہے وہ تیری پیاری انجمن
کس قدر دلچسپ تھی احباب کی بزمِ سخن

وہ رشیدِ خوش بیاں ۔ وہ مظہرِ معنی طراز
جنکے اک اک شعر میں سو سو طرح کے سوز و ساز

شوقی و فیاض فاروقی سخن رس نکتہ داں
شاعرِ شیوا بیان و ناثرِ شیریں زباں

بحرِ مواجِ مضامینِ نوی نازک رقم
حضرت ادریس صدیقی کا وہ زورِ قلم

عالمِ اخبار کی وہ معرکہ آرائیاں
اپنے اپنے طرز پر سب کی قلم فرسائیاں

مستِ صہبائے سخن سرشار کی کیفیتیں
اور وہ ایجاد کے اشعار کی کیفیتیں

حضرتِ میکش دکن میں گو وطن سے دور تھے
آتے جاتے رہتے تھے اسمیں نہ کچھ مجبور تھے

عارفِ ونعمت کا وہ حسنِ تخیل دور کا
اور بزرگانہ کرم وہ شوکتِ مغفور کا

وہ حکیم ارشاد احمد عیش و باطن تھانوی
ذوقی و انعام انصاری و محسن تھانوی

عاقلِ خوش فکر و احسانِ سخنور ذی کمال
طالبِ نغمہ سرا و ہوشِ پاکیزہ خیال

الغرض شیرازہ اچھا تھا بکھرنے کے لئے
ہستیاں ہوتی ہیں پیدا جیسے مرنے کے لئے

اب تامل اسمیں ہے یہ واقعی تھا یا نہ تھا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

جیتی جاگتی تصویر

کتنے اصرار سے دی چھپنے کو تصویر اپنی
اور سمجھا کئے رسوائی ہے تشہیر اپنی

یعنی خود محوِ تماشا کا تماشا ہونا
کچھ تعجب سا تھا اُن کے لئے ایسا ہونا

یا یہ کہئے کہ طبیعت میں نمایش ہی نہیں
خواہشِ مدح و تمنائے ستایش ہی نہیں

ایک ہم کیش کی صورت جو نظر آئی ہے
آج ممنونِ نظر چشم تماشائی ہے

خوب نقاش مضامیں کا یہ نقشہ دیکھا
بولتی چالتی تصویر کا جلوہ دیکھا

ایسے ہوتے ہیں خوش افکار طبیعت والے	ایسے ہوتے ہیں مزیدار طبیعت والے

کوئی اس پیکرِ تصویر کو مجھ سے پوچھے بےزبانی میں بھی دعویٰ تھا زباندانی کا ہوا صورت سے عیاں ذہن میں تھا جو جو کچھ	اِس خموشی میں بھی تقریر کو مجھ سے پوچھے نقشِ تصویر بھی آئینہ تھا حیرانی کا سُننے والوں نے سُنا اُس نے کہا جو جو کچھ

کیا کہوں عالمِ تصویر کا اندازِ سکوت ہائے وہ حُسنِ تخیّل کا سماں آنکھوں میں کیسی کیفیتیں حاصل ہیں فراموشی میں	صدقے صد شانِ تکلم ترے اُورازِ سکوت ایک دُنیائے تصوّر تھی نہاں آنکھوں میں اِس مرقع سے کوئی پوچھ لے خاموشی میں

شاہدِ شعر کے صورتگرو مانی نادر چہرہ پردازِ سُخن جلوہ طرازِ اشعار	حُسن افروزِ عروسانِ معانی نادر ناظمِ بے بدل و شاعرِ شیریں گفتار

ہر طرف دھوم ہی تیری سُخن آرائی کی
سچ تو یہ ہے کہ یہی شان ہے گویائی کی

خیر مقدمِ دوست

ہجر میں جسکے ہوا تھا مراتن مثل قدید
مدتوں سے تھی مجھے جسکی تمنائے دید

جسکی فرقت میں شب قدر کی کچھ قدر نہ تھی
اور تھا مجھکو محرم کی طرح روزِ عید

واسطے جسکے دعا مانگتا تھا میں ارشد
ہاتھ پھیلا کے بدرگاہِ خداوند رشید

شکر صد شکر ملاقی ہوا وہ آج آکر
جو کہ دل سے تو قریب اور تھا نظروں سے بعید

دشتِ غربت سے چلے آئینگے آوارہ مزاج
گردشِ چرخ سے ہو سکتی تھی کس کو اُمید

دل میں وہ جوشِ مسرت ہی کہ سبحان اللہ
واہ وا آئے ہیں کیسے مرے ایام سعید

پھر وہی لطفِ ملاقات وہی بزمِ طرب
پھر وہی لطفِ سخن اور وہی گفت و شنید

برزباں اب تو ہے یہ شعر کسی شاعر کا
جو کہ تھا اپنے زمانہ میں یگانہ و وحید

للہ الحمد ہر آنچیز کہ خاطر میخواست
آخر آمد ز پسِ پردۂ تقدیر پدید

سیرِ باغ

صبح کا تھا وقت اور سورج ابھی نکلا نہ تھا
ٹھنڈی ٹھنڈی چل رہی تھی باغ میں بادِ صبا

جھومتے تھے اس ادا سے صحنِ گلشن میں درخت
ہو اثر انگڑائیوں میں جیسے خوابِ ناز کا

سبز پوشاکیں پہن رکھی تھیں شاخوں نے تمام
قطرۂ شبنم کے موتی ٹنک رہے تھے جا بجا

ہنس بھی پڑتی تھیں چٹکتی بھی تھیں شرماتی بھی تھیں
چھیڑتی تھی آ کے کلیوں کو اگر موجِ ہوا

کھِل کھِلا کر ہنس رہے تھے پھول سارے باغ کے
کر رہی تھی عنبر افشانی شمیمِ جانفزا

عندلیبانِ چمن اس شان سے تھیں نغمہ زن
جیسے گائے کوئی صوفی وجد میں حمدِ خدا

فاختہ بیٹھی ہوئی تھی سرو پر اک ناز سے
قمریاں "حق سرہٗ" کی دیتی پھرتی تھیں صدا

ننھّی ننھّی تتلیوں کا چھوٹے پودوں پر ہجوم
وہ لپٹنا پھول سے - اُڑنا - پھر آ کر بیٹھنا

لہلہاتا تھا ہوا سے سبزۂ سرمستِ خواب
جیسے میٹھی نیند سے ہے یہ ابھی سو کر اُٹھا

ناچتا تھا مور اپنی دُم ہلائے بار بار
کر رہے تھے زمزمہ سنجی طیورِ خوشنوا

پردۂ مشرق سے آخر آفتاب آیا نکل
اور شعاعوں سے زمانہ سارا روشن کر دیا

آ چلی گرمی ہوا میں اور تپش بڑھنے لگی
رفتہ رفتہ دھوپ نے نقشہ لیا اپنا جما

اب کمی ہونے لگی دلچسپیٔ گلزار میں
اور وقتِ سیر بھی اب ختم بالکل ہو گیا

پہنچا تھوڑی دیر میں خورشید تا نصف النہار
اور بڑے گھنٹے نے ٹن ٹن سے دیئے بارہ بجا

کچھ عجب پژمردگی سی چھا گئی ہر پیڑ پر
پتے مرجھائے ہوئے ہر پھول کملایا ہوا

اب نہ ویسی تازگی تھی اور نہ شادابی کہیں
اتنے ہی عرصہ میں عالم ہو گیا اک دوسرا

اُڑ گئے ایک ایک کر کے سارے مرغانِ چمن
باغ کا مالی فقط تنہا وہاں بیٹھا رہا

زندگی باقی ہے تو کل آئینگے پھر وقتِ صبح
میں بھی ارشد سوچ کر یہ - اپنے گھر آیا چلا

تضمین دلنشیں

موسم برسات فصلِ خوشگوار
جھوم کر آئی گھٹا مستانہ وار

ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا یہ سبزہ زار
ہوگیا ہے اب تو دل بے اختیار

ساقیا برخیز و پر کن جام را
خاک بر سر کن غمِ ایام را

میں شرابِ عشق سے مخمور ہوں
بیخودیِ شوق میں مسرور ہوں

محوِ حسنِ جلوۂ مستور ہوں
کشمکش سے زندگی کی دور ہوں

بادہ در دہ چند ازیں بادِ غرور
خاک بر سر نفسِ نافرجام را

ہونیوالا ہوں میں رسوا کجہاں
چاہتا ہوں پھر وہی بیباکیاں

اہلِ ظاہر کہہ رہے ہیں پھبتیاں
ہو کرم کی اک نظر پیرِ مغاں

ساغرِ مے در کفم نہ تا ز سر
بر کشم ایں دلقِ ازرق فام را

دیدۂ تر تو نے یہ کیا کر دیا
گرچہ مجھکو خوب رسوا کر دیا

آنسوؤں سے راز افشا کر دیا
خیر پختہ مغز ایسا کر دیا

گرچہ بدنامیست نزدِ عاقلاں
مانمیخواہیم ننگ و نام را

سوزشِ پنہاں کا کیا کیجے بیاں
آ نہیں سکتی لبوں تک بھی فغاں
گر سکے اظہار کب تابِ زباں
کیا سُنے گا کوئی میری داستاں

دودِ آہِ سینۂ سوزانِ ما
سوخت ایں افسردگانِ خام را

کس لئے ہُوں اسطرح سینہ فگار
کس کو میں دکھلاؤں اپنا حالِ زار
کیوں مرا جاتا رہا صبر و قرار
کون ہے دنیا میں میرا غمگسار

محرمِ رازِ دلِ شیدائے من
کس نمی بینم زخاص و عام را

میں اگرچہ خانماں برباد ہُوں
دلفگارِ ناوکِ بیداد ہُوں
ہمنورد قیس یا فرہاد ہُوں
یہ سہی سب کچھ مگر دلشاد ہُوں

باد لا را مے مرا خاطر خوش ست
کز دلم یکبار برد آرام را

ہے عیاں گلشن سے شانِ کردگار
بُلبلیں بھی نغمہ زن ہیں گو ہزار
تختۂ گُل پر بھی آئی ہے بہار
جھومتے ہیں پیڑ بھی مستانہ وار

ننگرد دیگر بسرو اندر چمن
ہر کہ دید آں سرو گُل اندام را

چار دن کی کامرانی ہی یہاں
رنج ہے یا شادمانی ہی یہاں

چند روزہ زندگانی ہے یہاں
الغرض جو کچھ ہے فانی ہی یہاں

از سرِ دنیا گذشتی غم مخور
خوش بخور ہم خوش بدار ایام را

آدمی جس امر کی کوشش کرے
لیکن استقلال اُسمیں شرط ہے

اور تکلیفوں سے بے پروا ہو
کامیابی ہے اُسی کے واسطے

صبر کن حافظ بسختی روز و شب
عاقبت روزے بیابی کام را

حُسنِ فطرت

آئی ہے اب کے برس دھوم سے فصلِ بہار
پیڑ ہر اک بنگیا قامتِ موزونِ یار
سرو پہ ہیں قمریاں اور گلوں پہ ہزار
دیکھ کے یہ سبزی دیکھ کے یہ لالہ زار

سبزہ کا نکھرا ہے رنگ صاف ہی ہر برگ و بار
جھومتے ہیں شاخوں پر غنچے بھی مستانہ وار
موجِ نسیمِ چمن یا ہے ختن کا سوار
صنعتِ قدرت پہ دل چاہتا ہے ہو نثار

برگ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

خوابِ شیریں

رات ناسازیِ آفاق سے حیراں ہوکر
اپنی برگشتگیٔ بخت سے گریاں ہوکر
فرطِ آلامِ زمانہ سے پریشاں ہوکر
سرِ بستر جو گیا یاس سے نالاں ہوکر
اِک اُمنڈ آیا خیالات کا دل پر سیلاب
ہوگیا بحرِ تفکر میں سراپا غرقاب

بخت واژوں کی شکایت ہوئی لب پر جاری
مضطرب دیکھکر اپنی کبھی یوں ناچاری
برزباں تھی فلکِ سفلہ کی ناہنجاری
کبھی اِس شعر کو پڑھنا بصد آہ و زاری
شرح ایں آتشِ جانسوز نگفتن تا کے
سوختم سوختم ایں سوز نہفتن تا کے

پھر تعمق کی نظر نے یہ تماشا دیکھا
مختصر قصہ کئے دیتا ہوں کیا کیا دیکھا
الم و درد و غم و رنج بلا کا دیکھا
شیشۂ دل میں بھرا خون تمنّا دیکھا
کہہ نہیں سکتا کہ کیا ہوگئی حالت میری
اور بھی ہوگئی بیچین طبیعت میری

کام دیتے نہ تھے کچھ وہم و گماں اور قیاس
ور آتے تھے ہزاروں ہی طرح کے وسواس
بڑھتا جاتا تھا ہر اِک لحظہ مرا بیم و ہراس
غالب آکر ہوا اکبارگی اِن سب پر نعاس

رنج و اندوہ و الم سب چھڑا یا اس نے
بیخودی کا عجب اک جام پلایا اس نے

اب نہ کلفت تھی نہ الجھن تھی نہ حیرانی تھی
نہ تفکر نہ تردد نہ پریشانی تھی
سعی ناکام کی کاہش نہ پشیمانی تھی
فقط آسودگیوں کی ہی فراوانی تھی

واہ کیا کہنے ترے اے مرے خوابِ شیریں
کیوں نہ مخلوق سے تو پائے خطابِ شیریں

سب کو ہوتی ہے ترے آنے سے قوت حاصل
نور آنکھوں کو تو دل کو ہے مسرت حاصل
جسم کو تیری عنایت سے ہے صحت حاصل
تازگی روح کو ہے تیری بدولت حاصل

تیری ہی ذات سے حاصل ہے توانائی بھی
فہم بھی عقل بھی ادراک بھی دانائی بھی

کشمکش ہائے جہاں سے نہیں ملتا جو فراغ
اور بجھتا نظر آتا ہے اُمیدوں کا چراغ
دل اُلجھ جاتا ہے ہو جاتا ہے بیکار دماغ
اور ہو جاتا ہے گم منزلِ مقصد کا سُراغ

اس قدر جد و جہد کرکے جو تھک جاتے ہیں
جادۂ سعی سے مجبور بہک جاتے ہیں

زندگی تلخ سی ہو جاتی ہے ناکامی سے
جی میں آتا ہے گزر جایئے اپنے جی سے
یہ خیالات ستاتے ہیں بڑی سختی سے
نیند اسوقت بچاتی ہے تو بےچینی سے

مہربانی سے تری چین سے سو جاتے ہیں
فارغ البال ہر اک فکر سے ہو جاتے ہیں

تأہل

مرد و عورت سے مرکب نوعِ ہی انسان کی
جس طرح ہستی میں ہے ترکیب جسم و جان کی

لازم و ملزوم ہیں جیسے کہ نور و آفتاب
یا یہ کہئے بوئے خوش گلشن میں ہے جانِ گلاب

اقتضا فطرت کا ہے دونوں میں شانِ اتحاد
ہے یہی قانونِ ہستی کی عبارت سے مراد

کہہ رہا ہے تجربہ باہم رہو شیر و شکر
کر دیا ہے مطلعِ ماضی نے استقبال پر

ارتقا کا مسئلہ بھی ڈالتا ہے روشنی
ہے تمدّن کی ترقّی کا سبب یہ زندگی

گو فرائض میں نظر آتا ہے چنداں اختلاف
متحد لیکن مقاصد میں ہیں دونوں یہ ہی صاف

جبکہ منشائے ''نیچرل لا'' کا ہو جذب و اتصال
پھر تعجب ہے کہ ہو تعمیل وجہ انفعال

ہے بقائے نوعِ انسانی کا اس پر انحصار
ہے نظامِ عالمِ اسباب کا اس پر مدار

ہاں مگر بے احتیاطی کا نتیجہ ہے خراب
یعنی تکلیفیں بڑھا دیتا ہے ''نقصِ انتخاب''

اشتراکی زندگی میں یہ ضروری ہیں صفات
''ہم خیالی'' پہلے۔ اُسکے بعد ''حسنِ التفات''

ہو نہیں سکتی کبھی پیدا بہم بیگانگی
سعی کی جائے اگر اس میں قرارِ واقعی

جب طبائع ہونگی یکساں لازمی ہے اتفاق
ورنہ نامانوسیت کا خاصہ ہے انفراق

صحبتِ ناجنس سے سو بار ارشد الحذر
زندگی بھی تلخ اس سے عاقبت بھی پُر خطر

با مخالف مشرباں یکجا نشستن خوب نیست
ایں غلط مجموعہ را شیرازہ بستن خوب نیست

تعلیم نسواں اور پردہ

بحث احباب کا سبجکٹ تھا ایجوکیشن
جوش تقریر سے جلسہ تھا بڑے زوروں پر

متفق اس پہ تھے سب عالم و فاضل ہو جائیں
ڈاکٹر ہو کوئی جج ہو کوئی ہو بیرسٹر

کام لیں صنعت و حرفت سے نہ بیٹھیں خاموش
کمپنی ۔ فکٹری ۔ ہر شے کی بنائیں مل کر

دیں زراعت کو تجارت کو ترقی اتنی
روم سے شام سے ایران سے آئیں آڈر

چھوڑ دیں مال ولایت سے منگانا تاجر
اپنے ہی ملک کی ہر چیز ہو! بڑھ کر چڑھ کر

"میڈ ان انڈیا" سامان ہو اتنا اچھا
جسکی فرمائشیں باہر سے کریں سوداگر

فخر ایجاد کا ہم لوگوں کو بھی حاصل ہو
اہل یورپ ہی میں کچھ ایسے نہیں ہیں جو ہنر

ہم بھی کچھ کام کریں عقل کے گھوڑے دوڑائیں
ہم بھی اُڑنے لگیں مرکب میں ہوا کے اوپر

ہم بھی محنت سے بنانے لگیں ایسی عمدہ
لینڈو ۔ بائی سکل ۔ ریلوے ۔ ویگنٹ موٹر

روشنی بجلی کی اور سلسلۂ ٹیلگراف
کر کے قائم انھیں ۔ دکھلا دیں ہم اپنا بھی ہنر

سینری یہ جو نظر آتی ہے عالم کی نئی
ہے یہ تعلیم کا پھیلایا ہوا سب منظر

کی ہے امریکہ نے صنعت میں ترقی اس سے
اختراعوں اسکے لکھے جاتے ہیں جسکے دفتر

کی اسی علم سے انگلینڈ نے حاصل عظمت
روس پر پائی اسی علم سے جاپان نے ظفر

ماحصل نکلا یہ جبتک کہ نہ ہوگی تعلیم
ہو نہیں سکتی کسی قوم کی حالت بہتر

یہی قوموں کی ترقی کا مدارِ کل ہے
زندگی ابتو ہے بے علم کے خوار و ابتر

ختم ہونے پہ نہ آئی تھیں ابھی اسپیچیں
اور باقی تھا کئی ایک کو دینا لکچر

اتفاقاً کہیں ارشد بھی ادھر آ نکلے
اسی سوسائٹی کے ایک تھے وہ بھی ممبر

چند لوگوں نے کہا آپ بھی تو کچھ کہئے
رائے عالی کا بھی اظہار ہو ہم لوگوں پر

بولے تعلیم کے ہیں ایسے فوائد بیّن
جس سے منکر نہیں ہو سکتا کوئی فردِ بشر

طلبِ علم کا مذہب بھی بڑا حامی ہے
زور دیتے ہیں ہمیشہ سے اسی پر لیڈر

جو کہا جائے بجا۔ جتنا کہا جائے درست
فکر لیکن یہ ہے تحصیل ہو اسکی کیونکر

عورتوں کو تو پڑھانے سے تنفر تم کو
اور خواہش یہ کہ لڑکوں کو ہو سب کچھ ازبر

تربیت جب نہ ہو تعلیم کہاں سے ہوگی
پہلے بچوں پہ ہوا کرتا ہے ماؤں کا اثر

جب یہی زیورِ تعلیم سے عاری ہونگی
عقل پر آپ ہی بچوں کی پڑینگے پتھر

جو نہیں جانتا خود۔ کیا۔ وہ کسی کو بتلائے
خود ہی جو گم ہو بنے کیا وہ کسی کا رہبر

اخترِ بخت کا چمکانا اگر ہے منظور
روشنی علم کی پھیلائیے گھر کے اندر

لڑکیوں کو بھی ہے ایسے ہی پڑھانا لازم
جیسے ہر علم ہیں لڑکوں کو پڑھاتے فرفر

ایک صاحب نے کہا پردہ ندارد ہوگا
چار آنکھوں سے وہ پھر دیکھیں گی اندر باہر

ہنس کے ارشد نے جواب انکو دیا اے مشفق
تم نہیں جانتے العلم حجاب الاکبر

سانچی

ریاست بھوپال کے مشرقی گوشے کے ایک پُر فضا مقام کا نام "سانچی" ہے جس کو آثار قدیمہ کی تاریخی اہمیت نے بہت زیادہ مشہور کر دیا ہے۔

کس قدر دلچسپ ہے یہ سبزہ زارِ کوہسار
تازگی بخشِ دل و جاں ہے بہارِ کوہسار

کیا سہانی سینری ہے کیا سوادِ پُر فضا
کیا مزے کی سیر ہے منظر ہے کتنا خوشنما

دستِ قدرت کی نمایاں ہر طرف گلکاریاں
حسنِ فطرت کی عیاں ہر سمت جلوہ زاریاں

تو ہو او "سانچی" کے جنگل غیرتِ باغِ عدن
دامنِ صحرا میں نظّارے کو ہی لطفِ چمن

دلکشی کے اور بھی ساماں مہیا ہیں یہاں
یعنی آثارِ قدیمہ یادگارِ رفتگاں

دستبردِ عہد سے جو ہو گئے بالکل کھنڈر
کچھ برائے نام باقی رہ گئے دیوار و در

آج بھی اُن پر برستا ہے مگر جاہ و جلال
اب بھی ظاہر ہو رہا ہے اگلے لوگوں کا کمال

اِن عماراتِ شکستہ میں بہت کچھ ہیں نہاں
بودھ مذہب کی ترقی کے زمانہ کے نشاں

یہ فرازِ کوہ پر گنبد جو قائم ہیں ہنوز
دیکھنے آتے ہیں جنکو دور سے سیّاح روز

دو مکاں ہیں چار دیواری کی صورت انکی ہے
بیچ میں ہیں ان کے گنبد جنکو کہتے ہیں بھٹے

جو تصاریف زمانہ سے شکستہ حال ہیں
مختلف ہیں۔ انکی نسبت جسقدر اقوال ہیں

لوگ کہتے ہیں، بڑا گنبد عبادتخانہ تھا
اور چھوٹا ایک مقدّس شخص کا کاشانہ تھا

بعض کی تحقیق سے ثابت ہوے یہ مقبرے ۔ اصلیت سچ پوچھئے تو انکی تاریکی میں ہے
چند کتبے بھی ہیں انپر جو پڑھے جاتے نہیں ۔ اگلے لوگوں کے نوشتے فہم میں آتے نہیں
سنتے ہیں پہلے یہاں سنکا نگر آباد تھا ۔ فارغ البالی سے جسمیں ہر بشر دلشاد تھا
اب نشاں تک بھی نہیں باقی کوئی اُس شہر کا ۔ کھچ رہا ہے ایک نقشہ انقلابِ دہر کا

یونہیں مٹ جائینگے سارے نقشِ ہستی ایک دن ۔ اور ویراں ہوگی کُل دُنیا کی بستی ایک دن
خاک میں ملجائینگی یہ چلتی پھرتی مورتیں ۔ اور فنا ہو جائینگی اچھی بُری کُل صورتیں
پھر نہ پیسے گی کسی کو گردشِ لیل و نہار ۔ رنگ لائیگا نہ پھر کچھ انقلابِ روزگار
شکوہ جورِ فلک ہوگا نہ قسمت کا گلہ ۔ لوٹ جائے گا یہ گونا گونیوں کا سلسلہ
پھر نہ آئے گی گلستاں میں بہارِ جانفزا ۔ اور نہ ہونگے شاہدانِ گُل کبھی جلوہ نما
یہ نسیمِ صبح کی ہونگی نہ عنبر بیزیاں ۔ اور نہ مرغانِ خوش الحاں کی ترانہ ریزیاں
پھر نہ ہوگا میکدوں میں بادہ نوشونکا ہجوم ۔ مدرسوں میں بھی نہ ہوگا درس و تدریسِ علوم
منعقد ہوگی نہ پھر احباب کی بزمِ طرب ۔ قہقہے یارونکے ہونگے اور نہ کچھ شور و شغب
شعرگو ہونگے نہ اُنکی محفلِ شعر و سخن ۔ کوئی سوسایٹی ہوگی اور نہ کوئی انجمن
پھر کمال اپنا دکھائینگے نہ اربابِ نشاط ۔ سب کے سب معدوم ہوجائینگے اسبابِ نشاط

الغرض مٹ جائیگا ہر چیز کا نام و نشاں
ہر طرف چھا جائیگا اک عالمِ ہو کا سماں

تغزّل

آشفتگی سے در خورِ محفل نہیں رہا
اب میں غزل سرائی کے قابل نہیں رہا

ا

نقشِ تصویر ہوں آئینۂ حیراں ہوں میں
یعنی منت کشِ نظارۂ جاناں ہوں میں

سادگی ہائے تمنّا کہ بصد ناکامی
محوِ اُمید کرم ہائے فراواں ہوں میں

لذت افزائے خلش کاوشِ چارہ گر ہی
تم سمجھتے ہو کہ گرویدۂ درماں ہوں میں

سوزِ دل نے ہمہ تن داغ بنا رکھا ہی
بہرِ نظارہ گیاں سروِ چراغاں ہوں میں

اب تمنّا نہیں ایذا طلبی کی دل کو
ناوکِ یار کا شرمندۂ احساں ہوں میں

کہہ رہا ہے یہ ترا جلوۂ نظارہ سوز
لاکھ عریاں ہوں مگر پھر تہ داماں ہوں میں

اپنی ہستی ہی سے پہلے جو مٹا جاتا ہوں
کیا کسی وعدہ فراموش کا پیماں ہوں میں

کبھی جمعیتِ خاطر سے ٹھہرنا نہ ہوا
بزمِ جاناں میں دلِ غیر کا ارماں ہوں میں

مجھ سے پوچھے کوئی انجام فریبِ ہستی
عبرت آموزِ پئے خواہش نگاہاں ہوں میں

ذوقِ اُمید میں کس لطف سے گزری ہے حیات
نارسائیِ مقدر کا ثنا خواں ہوں میں

ٹھہری آخر کو عبث کوششِ برقِ خرمن
گلشنِ دہر میں وہ سوختہ ساماں ہوں میں

ناگواری سے تری تلخیٔ ایامِ حیات
اپنے آغاز میں واماندۂ پایاں ہوں میں

کثرتِ درد سے دل کیوں نہ بھر آئے میرا
کوئی پتھر تو نہیں آخرش انساں ہوں میں

اب تو ہر وقت تصور میں ہیں اُنکے گیسو
اپنی آشفتہ مزاجی سے پریشاں ہوں میں

غلطی سے متحیر کو وہ مجنوں سمجھے
محض اک صورتِ آرایشِ زنداں ہوں میں

دھوم ہی تابشِ خورشید قیامت کی بہت
اے خدا کاش وہاں چاک گریباں ہوں میں

ہائے ناکامیِ جاوید مری اے ارشدؔ
وقف یاس و الم و حسرت و حرماں ہوں میں

۲

گر آئے سیر ہم بھی ترے جلوہ گاہ کی
کشتِ اُمید نذر تھی برقِ نگاہ کی

باتیں وہ کر رہے ہیں محبت کی چاہ کی
اے جذب دل یہی تو ہے تاثیر آہ کی

ہم محوِ ذوقِ دید ہیں۔ بزمِ خیال میں
تصویر کھینچ لی ہے تری جلوہ گاہ کی

کچھ انتہا بھی میری سیہ کاریوں کی ہے
نکلی نہ آرزو کبھی دل سے گناہ کی

چند آرزوئیں مردہ کچھ ارماں مٹے ہوئے
حالت نہ پوچھئے دلِ حسرت پناہ کی

تیار التفات تو ہو جائیں وہ مگر
تجویز پہلے سوچ لیں کوئی نباہ کی

ہاتوں میں اُنکے دزدِ حنا گیسوؤں میں خم
یہ صورتیں ہیں دل کے لئے اشتباہ کی

اللہ اپنی تیرگیِ بخت کیا کہوں
گرہ
ظلمات دھوپ ہے مرے روزِ سیاہ کی

ارماں بھرے دلوں کو بھی بےچین کر دیا
حسرت نصیب کون تھا یہ جسنے آہ کی

نا آشنائے محفلِ ستمگر جفا شعار
اُسکو پڑی ہے کیا مرے حالِ تباہ کی

محشر میں سب ہیں محوِ تماشائے حسنِ یار
سُنتا نہیں ہے کوئی کسی داد خواہ کی

رندانِ بادہ نوش کو زاہد نہ کہہ برا
دیواریں تجھ پہ گر نہ پڑیں خانقاہ کی

تارِ نظر ہیں ڈھونڈھتے ہیں نقشِ پائے دوست
کرنیں زمیں پہ گرتی نہیں مہر و ماہ کی

سینہ میں ہے مرے نہ خمِ زلفِ یار میں
ملتی خبر نہیں دلِ گم کردہ راہ کی

تم خود ہی کر دو میری وفاؤں کا فیصلہ
حاجت بیاں کی ہے نہ ضرورت گواہ کی

کیا میکدے میں شیخ جی تشریف لائے ہیں
آواز آرہی ہے یہ کیوں قاہ قاہ کی

ارشد لکھی ہے خاطرِ رونق سے یہ غزل
خواہش نہیں ہے بزم میں کچھ واہ واہ کی

۳

کچھ نہ کچھ گوشۂ دل میں مرے پنہاں نکلا
کبھی ناوک کبھی نشتر کبھی پیکاں نکلا

کام تجھ سے کبھی اے گردشِ دوراں نکلا؟
کوئی اُمید بر آئی کوئی ارماں نکلا؟

جلوۂ طور کے مشتاق بہت تھے موسیٰ
وہ بھی اندازِ حجابِ رخِ جاناں نکلا

کر دیا خوگرِ غم اُسکی جفا کوشی نے
میں نہ خمیازہ کشِ رنجِ فراواں نکلا

دھوم ہنگامۂ محشر کی بہت سنتے تھے
یہ تو اک مجمعِ احبابِ پریشاں نکلا

رہ گئی تھی یہی اک بوند لہو کی باقی
قطرۂ خونِ جگر نازشِ پیکاں نکلا

چارہ سازوں سے نہ آنکھیں ہوئیں نیچی میری
دردِ دل میرا نہ گرویدۂ درماں نکلا

متردد - متفکر - متحیر - ہو کر	کوچۂ یار سے ہر دید کا خواہاں نکلا
ناز تھا ہم کو بہت جس دلِ مستغنی پر	نگہِ ناز کا شرمندۂ احساں نکلا
خندۂ گُل میں نہاں چاک گریبانی تھی	سببِ عیش ہی اندوہ کا ساماں نکلا
رعب سے حُسن کے کچھ کہہ نہیں سکتا کوئی	جلوۂ یار ہی خود اپنا نگہباں نکلا
ہو تو سکتا ہے مگر پھر بھی نہیں ہوتا ہے	نقشِ اُمّید مرا صورتِ امکاں نکلا
نہ دیا چین پراگندگیِ دل نے مجھے	کبھی جمعیتِ خاطر کا نہ ارماں نکلا
اِن بتوں میں تو عجب شان نظر آتی ہے	حسنِ مستور چراغِ تہِ داماں نکلا

لاکھ حالِ شبِ غم اُن کو سُنایا ارشد
مدعا دل کا نہ لیکن کسی عنواں نکلا

۴

نظارہ سوز کیوں نہ رخِ بے نقاب ہو	کچھ تو نگاہِ شوق کا آخر جواب ہو
میں انتظارِ لطف میں ہوں بیقرار اور	تم محوِ سیرِ منظرِ صد اضطراب ہو
ناکامیِ اُمید کے قربان جائیے	کیوں وقفِ آرزو دلِ حسرت مآب ہو
شوریدگیِ عشق سے ہنگامہ زار ہے	اب اور کیا خراب جہانِ خراب ہو
پایانِ درد و رنج کی مانند اے فلک	خمیازۂ نشاط میں بھی انقلاب ہو
اُلجھائیں اُسکو میری پریشانیاں اگر	زلفِ دراز کو نہ کبھی پیچ و تاب ہو
نظارگی ہے چشمِ تمنا کے گرد و پیش	کیونکر رہینِ منتِ تصویرِ خواب ہو

ارمان مٹتے دیکھے نہ جائینگے اے خدا
مانوس انحطاط نہ رنگِ شباب ہو
شیرازۂ خیال کا محشر ہے اک ورق
ارشد غضب ہو جمع اگر یہہ کتاب ہو

تضمین جدید

در غم و رنج پریشاں نشود
وز الم چاک گریباں نشود
وقتِ مایوسیٔ حرماں نشود
شاکیٔ گردشِ دوراں نشود
مرد باید کہ ہراساں نشود
مشکلے نیست کہ آساں نشود
درد آں نیست کہ درماں نشود

رباعی

تعلیم ہے عورتوں کا اچھا زیور
ہو جاتی ہے اس سے اُنکی حالت بہتر
آنکھوں پہ حیا کا پردہ پڑجاتا ہے
مشہور ہے العلم حجاب الاکبر

تمت

بیاضِ ارشد

رشکِ گلزارِ ارم ہی یہ ریاضِ ارشد
قابلِ دید ہے واللہ بیاضِ ارشد
(رونق دہلوی)

مصنف حسنِ تخیل کے وہ گوہرِ افکار جن کو انکی جدت پسند طبیعت نے سب سے پہلے دامنِ کاغذ پر بکھیرا ہے، اور حضرت قیصر (ایڈیٹر الحجاب) نے اِن کو ایک سلک میں منسلک کرکے دنیائے سخن میں پیش کیا ہے۔ اسکے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ایک سحر طراز شاعر کا ابتدائی کلام کسقدر دلچسپ ہوتا ہے۔ ہر غزل مرصع اور ہر شعر تیر و نشتر ہے۔ ۶؍ قیمت پر مصنف موصوف سے بھوپال کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

حسنِ تخیل کے ملنے کا پتہ
منیجر انڈین پریس۔ الہ آباد